ہماری نفسیات

انجمن ترقی اردو ہند

سلسلۂ انجمن ترقّیٔ اُردو نمبر ۱۱۵

ہماری نفسیات

ای۔ اے۔ مینڈر کی کتاب

سائیکالوجی فار ایوری مین اینڈ وومن

مترجمۂ

شیدا محمد صاحب

شایع کردہ

انجمنِ ترقّیٔ اُردو (ہند) دہلی

۱۹۳۹ء

خاں صاحب عبداللطیف نے لطیفی پریس دہلی میں چھاپا
اور
منیجر انجمنِ ترقیِ اردو (ہند) نے دہلی سے شایع کیا

ہماری نفسیات

فہرستِ مضامین

حصّہ سوم

شخصی کردار کی تخلیق

دیباچۂ مترجم

یہ کتاب اے۔ ای منڈر (A. E. Mander) کی کتاب سائیکالوجی فار ایوری مین اینڈ ویمن (Psychology for Every Man and Woman) کا ترجمہ ہی۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۵ء شایع ہوئی لیکن دو تین مہینے ہی میں اس کے تمام نسخے فروخت ہوگئے اور اسی سال اپریل میں دوسری مرتبہ، جولائی میں تیسری مرتبہ اور اگست میں چوتھی مرتبہ اس کو شایع کرنا پڑا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۳۶ء میں یہ پانچویں مرتبہ اور اکتوبر ۱۹۳۶ء میں چھٹی مرتبہ شایع ہوئی اور یہ چھٹا ایڈیشن ہی ہمارے سامنے ہی۔ معلوم نہیں اب تک اور کتنی بار یہ شایع ہو چکی ہی۔

کتاب کے متعلق مصنف نے اپنے دیباچے میں بیان کیا ہی کہ اس کو کیوں پڑھنے اور بار بار پڑھنے کی ضرورت ہی۔

مصنف نے کتاب کے آخر حصّے میں کردار کی تعمیر کے بیان میں بچپن کی تربیت اور ماحول پر زیادہ زور دیا ہی اور یہ واقعہ ہی کہ بچپن کی تربیت اور ماحول ہی آیندہ زندگی کی بُنیاد ہیں لیکن ہمارے یہاں اس زمانے کی تعلیم و تربیت کا کوئی خاص انتظام نہیں ہی اور اس کی سخت ضرورت ہی کہ اس کا خاص طور پر انتظام کیا جائے۔ گو تحتانی مدارس ہمارے ملک میں اچھی تعداد میں ہیں لیکن ان میں بچوّں کو صرف لکھنا پڑھنا سکھا دیا جاتا ہی اور کردار کی نشوونما کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہی حالانکہ یہی وہ نازک زمانہ ہی جس میں بچّے آیندہ زندگی کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس کے لیے یہ بہت ضروری ہی کہ ان کی تعلیم کا انتظام تجربہ کار اساتذہ کے سپرد کیا جائے جو بچّوں کی تعلیم و تربیت کے خاص ماہر ہوں۔ حیدرآباد میں اس قسم کا ایک مدرسہ ماڈل پرائمری اسکول ہی لیکن اس میں وہی بچّے پڑھ سکتے ہیں جو مستطیع اور ذی مقدر

گھرانوں کے ہیں ۔ ایسے مدارس ملک میں عام ہونے چاہییں اور ان مدارس کے جو کچھ بھی اخراجات ہوتے ہیں وہ سب سرکار یا لوکل فنڈ سے ادا ہوں تاکہ تمام طبقوں کے بچے ان سے مستفید ہوں ۔ ان اخراجات کی سبیل بھی دشوار نہیں ہے۔ جامعی تعلیم کے گرانبار اخراجات کو بہت کچھ گھٹایا جاسکتا ہے۔ دراصل موجودہ جامعی تعلیم بہت کچھ اصلاح طلب ہے۔

چھوٹے بچوں کے اقامت خانے بھی کھولے جانے کی سخت ضرورت ہے ۔ یہ اقامت خانے مختلف معیار پر قایم کیے جاسکتے ہیں لیکن تعلیم اور اساتذہ کے معیار میں کوئی فرق نہ ہونا چاہیے ۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ ماں باپ کے یکایک انتقال یا اور اسباب کی بنا پر بعض اوقات بچوں کو کوئی آسرا یا پناہ کی جگہ نہیں ملتی جس کی وجہ سے بہت سے بچے تباہ ہو جاتے ہیں ۔ اس کے سدِباب کے لیے شدید ضرورت ہے کہ بے خرچ اقامت خانے یا بالفاظِ دیگر یتیم خانے مشنریوں کے اصول پر کھولے جائیں جہاں غریب اور لاوارث بچوں کی تعلیم و تربیت کا کافی انتظام کیا جائے ۔ یہ کام بلدیہ سرکار کی امداد سے بخوبی کر سکتی ہے ۔

جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے یہ کتاب ہر شخص کو پڑھنے کی ضرورت ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک بہت ہی کام کی باتیں عام فہم عبارت میں بیان کی گئی ہیں +

دیباچہ مصنف

یہ کتاب کیوں پڑھی جائے

ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اپنے تخیلات و احساسات کے ہمیشہ جائزہ لینے کے خبط میں مبتلا ہو جائیں اور ہمیشہ اپنی ہی اُدھیڑبُن میں رہیں اور اپنے ہی بارے میں غور کرتے رہیں۔ لیکن جو شخص اپنے آپ کو بخوبی سمجھتا ہے وہ ضرورت سے زیادہ اپنے احساسات و تخیلات پر نظر نہیں رکھتا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیوں اپنے آپ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے ہماری مسرت میں اضافہ ہوگا۔ ہم اس کتاب میں بتائیں گے کہ بہت سے لوگ جو ناخوشی سے زندگی گزارتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی اصل احتیاج سے واقف نہیں ہوتے۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں اس کا جاننا ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہے لیکن ہم میں سے اکثر لوگ یہ بات نہیں جانتے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہمیں چین اور اطمینان حاصل نہیں ہے اور ہم پر ناکامی چھائی ہوئی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ در اصل ہمیں احتیاج کس چیز کی ہے اور وہ کیا چیز ہے جس سے زندگی اطمینان، چین اور مسرت سے گزر سکتی ہے۔ ہماری اکثر خواہشیں غیر شعوری ہیں اور ہمیں ان کا علم نہیں لیکن نفسیات سے تھوڑی سی واقفیت کی بدولت ہم ان کا پتہ چلا سکتے اور ان سے واقف ہو سکتے ہیں۔

ہم اس کتاب میں یہ بھی بتائیں گے کہ ہماری بہت کچھ ناخوشی کی وجہ ہمارے اندرونی اختلافات ہیں اور ہمارے دل میں خانہ جنگیاں برپا ہیں گو ہم ان خانہ جنگیوں سے واقف نہ ہوں۔ ہم متضاد خواہشیں اور متضاد ارادے رکھتے ہیں۔ ہماری طبیعت میں یکسوئی نہیں ہے اور ہمارا شیرازۂ خاطر درہم برہم ہے اور یہی وجہ ہماری ناخوشی کی ہے لیکن ہمارے اکثر اندرونی اختلافات سلجھائے جا سکتے ہیں ہم نفسیات سے کسی قدر واقف ہونے کے بعد اکثر صورتوں میں معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ اختلافات کیا ہیں، ان کو کیونکر دور کیا جا سکتا اور کس طرح کم از کم یکسوئی حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہمیں اپنے آپ کو جاننے اور سمجھنے کی اور وجوہ سے بھی ضرورت ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری مسرت

میں بلکہ ہماری قابلیت میں بھی اضافہ ہوگا۔

ہمیں لوگوں کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کو سمجھنے کے بعد ہی ہم ان کے ساتھ اچھی طرح پر رہ سکتے اور اپنے منشا کے مطابق ان پر اثر ڈال سکتے ہیں۔

ہمیں اپنے بچوں کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے اور ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہم کس طریقے کی تربیت سے ان کو اپنے منشا کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ کس طرح بعض پسندیدہ اوصاف و کردار ان میں پیدا کیے جا سکتے ہیں اور کیونکر کمزوریوں اور بری عادتوں سے ان کو بچایا جا سکتا ہے۔ ہر صاحب اولاد کو اس سے واقفیت کی ضرورت ہے۔

اپنی بیوی یا اپنے شوہر کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے دشمنوں اور دوستوں کے اغراض و مصالح کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عشق و محبت میں بھی طرفین کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ باہمی واقفیت کی مستحکم بنیاد پر ان کی آیندہ زندگی کی عمارت تیار ہو اور یہ نہ ہو کہ وہ ایک دوسرے کی طبیعت سے ناواقف رہ کر مصیبت کے ساتھ زندگی گزاریں۔

اپنے کاروباری رفقا کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اُستاد کو اپنے شاگردوں کے طرزِ عمل، اُن کے احساسات اور اُن کی ضرورتوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔ مالک کو اپنے ملازمین کے طبائع سے کچھ واقفیت ضروری ہے تاکہ انھیں سمجھ کر ان سے کام لے اور ملازمین کے لیے بھی یہ فائدہ مند ہے کہ وہ اپنے مالک کی طبیعت سے واقف ہوں۔

یہ کتاب ان چیزوں کے سمجھنے میں مدد دے گی لیکن اس کتاب کو ایک بار پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ حقیقی طور پر فائدہ اُٹھانے کے لیے اس کو کئی بار غور سے ذہن نشین کرتے ہوئے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ تحریری یادداشتیں بھی مفید ثابت ہوں گی۔

پڑھ چکنے کے بعد غور و خوض کی ضرورت ہے اور اس سے جو معلومات حاصل ہوں ان سے استفادے کی بھی +

حصّہ اوّل

خواہشات

انسانی فطرت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بنیادی خواہشات کو سمجھیں۔ ہر انسان میں بنیادی خواہشات موجود رہتی ہیں۔ ان خواہشات کی فہرست کے لیے صفحہ (۱۵) ملاحظہ ہو۔ متذکرہ خواہشات ہی وہ بنیادی خواہشات ہیں جو ہر انسان میں فطری طور پر ورثتہً پائی جاتی ہیں۔ ہر آدمی کے طرزِ عمل اور اس کے تمام احساسات کی بنیاد یہی خواہشات ہیں جو عادت کے ساتھ مل جل کر اس خاص طرزِ عمل اور احساسات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان خواہشات کی تکمیل سے اس کی زندگی مسرت بھری ہوتی ہے اور ان کی عدمِ تکمیل سے وہ پریشان، غیر مطمئن اور ناخوش رہتا ہے۔ اس کی یہ خواہشات ہی وہ زبردست بنیادی طاقتیں ہیں جن سے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے عمل کا ظہور ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے طرزِ عمل کا باعث بالواسطہ یا بلاواسطہ یہی بنیادی خواہشات یا کوئی ایک عادت ہے جو انھیں خواہشات سے وجود میں آتی ہے۔

اگر تم کسی مرد یا عورت کے ایک خاص طرزِ عمل اور خاص احساسات کی وجہ معلوم کرنا چاہتے ہو تو پہلی چیز یہ دیکھنی چاہیے کہ ان بنیادی خواہشات میں سے کون سی خواہش اس طرزِ عمل اور ان احساسات میں پوشیدہ ہے۔ اس کتاب پر پوری طرح عبور حاصل کرنے کے بعد اکثر و بیشتر حالات میں یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ کس شخص کے احساسات اور طرزِ عمل سے

کون سی خواہش ظاہر ہو رہی ہے۔

یہاں پر ایک اور چیز یاد رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ ممکن ہے کہ بنیادی خواہش مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے اپنے آپ کو ظاہر اور اسی کے ذریعے اپنا مدعا حاصل کرے۔ بالفاظِ دیگر تکمیلِ مدعا کے اگر بیس طریقے ہوں یا ایک سو ہوں یا ایک ہزار ہوں بنیادی خواہش ان میں سے کسی ایک طریقے سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ دو شخصوں کے عادات و اطوار میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی بنیادی خواہشات کو مختلف طریقوں سے اور مختلف رنگ میں ظاہر اور پورا کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ہم چند مثالوں سے اپنے بیان کو واضح کریں گے۔

(۱) ایک ڈرپوک جانور مثلاً چوہے کو اس کے بل سے نکال کر باہر چھوڑ دو تو بجائے اس کے کہ وہ کھلا رہے اپنے بل کا رُخ کرتا ہے۔ اس کا رُخ دوسری طرف بھی کر دو تو وہ موقع ملتے ہی بل کا راستہ لیتا ہے۔

(۲) کُتا چوہے سے زیادہ سمجھ دار جانور ہے۔ اگر کتے کو اس کے گھر سے دُور کسی مقام پر بند کر دیں اور پھر اس کو چھوڑ دیں تو وہ اپنے گھر کی تلاش میں دوڑتا پھرے گا اور مختلف راستوں کے چکر لگا کر اور اِدھر اُدھر مارا مارا پھر کر اپنے گھر کو پہنچ ہی جائے گا۔

(۳) اس سے پیچیدہ تر مثال آدمی کی ہے۔ ایک شخص پر دیس میں روٹی کی خاطر سکونت اختیار کرتا ہے۔ اس کے دل میں وطن کی یاد رہ رہ کر اٹھتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے وطن کو جائے۔ وطن واپس جانے کے لیے وہ بہت محنت کرتا ہے اور کسی قسم کا آرام اپنے لیے گوارا نہیں کرتا حتّٰی کہ شادی کی خواہش کو بھی رد کر کے رکھتا ہے اور جس قدر ہو سکے پس انداز کرتا جاتا

ہے۔ اس کی سب سے بڑی غرض جس کی وجہ سے وہ یہ تکلیفیں برداشت کرتا ہے یہ ہے کہ اس قدر پیس انداز ہو سکے کہ اپنے وطن کو جا سکے۔ یہاں بھی وہی گھر واپس جانے کی خواہش اس شخص کے طرزِ عمل میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوگا کہ ایک ہی بنیادی خواہش کس خاص رنگ سے اپنے آپ کو ظاہر کر کے مدّعا کی تکمیل کرتی ہے۔ اگر ایک جگہ بالکل فطری اور ابتدائی شکل میں ہے تو دوسری جگہ پردے کی آڑ میں ہے۔ وہی بنیادی غرض یا خواہش گھر لوٹنے کی ایک طرف چوہے کو تکمیلِ مدعا کے لیے ابھارتی ہے تو دوسری طرف حضرتِ انسان کو۔

خواہشات نامعلوم طور پر دبی ہوئی رہ سکتی ہیں

ہماری بنیادی خواہشات ہمارے دماغ میں اکثر و بیشتر نامعلوم طور پر رہتی ہیں اور ہم کو یہ خبر تک نہیں ہوتی کہ ہم کس بنیادی خواہش کی تکمیل کے درپے ہیں۔ صرف اس قدر ہم جانتے ہیں کہ ہم کو ایک خاص شے سے دلچسپی ہے اور اگر کسی شے سے دلچسپی نہیں ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی سے ایک گونہ مطمئن نہیں ہیں یا ناخوش ہیں۔

دماغ کی لاشعوری حالت جو کہی جاتی ہے وہ کوئی خاص راز کی چیز نہیں۔ دراصل شعوری دماغ اور لاشعوری دماغ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ شعوری دماغ کی مثال اسٹیج کے اس حصے یا اس آدمی کی سی ہے جو اسٹیج کی روشنی میں ہے۔ اسٹیج کے باقی حصے کو لاشعوری سمجھو جو موجود ہے لیکن روشنی میں نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تم اپنی گھڑی دیکھتے ہو۔ اس میں سوا دس بجے ہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ جلد چلنا چاہیے۔ یہ کام تمھارے شعوری دماغ نے کیا۔ گھڑی دیکھتے وقت تمھیں یہ خیال

کون سی خواہش ظاہر ہو رہی ہے۔

یہاں پر ایک اور چیز یاد رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ ممکن ہے کہ بنیادی خواہش مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقے سے اپنے آپ کو ظاہر اور اسی کے ذریعے اپنا مدعا حاصل کرے۔ بالفاظِ دیگر تکمیلِ مدعا کے اگر بیس طریقے ہوں یا ایک سو ہوں یا ایک ہزار ہوں بنیادی خواہش ان میں سے کسی ایک طریقے سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ دو شخصوں کے عادات و اطوار میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی بنیادی خواہشات کو مختلف طریقوں سے اور مختلف رنگ میں ظاہر اور پورا کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ہم چند مثالوں سے اپنے بیان کو واضح کریں گے۔

(۱) ایک ڈرپوک جانور مثلاً چوہے کو اس کے بل سے نکال کر باہر چھوڑ دو تو بجائے اس کے کہ وہ کھلا رہے اپنے بل کا رُخ کرتا ہے۔ اس کا رُخ دوسری طرف بھی کر دو تو وہ موقع ملتے ہی بل کا راستہ لیتا ہے۔

(۲) کُتّا چوہے سے زیادہ سمجھ دار جانور ہے۔ اگر کتّے کو اس کے گھر سے دُور کسی مقام پر بند کر دیں اور پھر اس کو چھوڑ دیں تو وہ اپنے گھر کی تلاش میں دوڑتا پھرے گا اور مختلف راستوں کے چکّر لگا کر اور اِدھر اُدھر مارا مارا پھر کر اپنے گھر کو پہنچ ہی جائے گا۔

(۳) اس سے پیچیدہ تر مثال آدمی کی ہے۔ ایک شخص پردیس میں روٹی کی خاطر سکونت اختیار کرتا ہے۔ اس کے دل میں وطن کی یاد رہ رہ کر اٹھتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنے وطن کو جائے۔ وطن واپس جانے کے لیے وہ بہت محنت کرتا ہے اور کسی قسم کا آرام اپنے لیے گوارا نہیں کرتا حتّٰی کہ شادی کی خواہش کو بھی روک کے رکھتا ہے اور جس قدر ہو سکے پس انداز کرتا جاتا

ہے۔ اس کی سب سے بڑی غرض جس کی وجہ سے وہ یہ تکلیفیں برداشت کرتا ہے یہ ہے کہ اس قدر پیس انداز ہو سکے کہ اپنے وطن کو جا سکے۔ یہاں بھی وہی گھر واپس جانے کی خواہش اس شخص کے طرزِ عمل میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوگا کہ ایک ہی بنیادی خواہش کس خاص رنگ سے اپنے آپ کو ظاہر کرکے مدعا کی تکمیل کرتی ہے۔ اگر ایک جگہ بالکل فطری اور ابتدائی شکل میں ہے تو دوسری جگہ پردے کی آڑ میں ہے۔ وہی بنیادی غرض یا خواہش گھر لوٹنے کی ایک طرف چوہے کو تکمیلِ مدعا کے لیے ابھارتی ہے تو دوسری طرف حضرت انسان کو۔

خواہشات نامعلوم طور پر دبی ہوئی رہ سکتی ہیں

ہماری بنیادی خواہشات ہمارے دماغ میں اکثر و بیشتر نامعلوم طور پر رہتی ہیں اور ہم کو یہ خبر تک نہیں ہوتی کہ ہم کس بنیادی خواہش کی تکمیل کے درپے ہیں۔ صرف اس قدر ہم جانتے ہیں کہ ہم کو ایک خاص شے سے دلچسپی ہے اور اگر کسی شے سے دلچسپی نہیں ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی سے ایک گونہ مطمئن نہیں ہیں یا ناخوش ہیں۔

دماغ کی لاشعوری حالت جو کہی جاتی ہے وہ کوئی خاص راز کی چیز نہیں۔ دراصل شعوری دماغ اور لاشعوری دماغ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔ شعوری دماغ کی مثال اسٹیج کے اس حصے یا اس آدمی کی سی ہے جو اسٹیج کی روشنی میں ہے۔ اسٹیج کے باقی حصے کو لاشعوری سمجھو جو موجود ہے لیکن روشنی میں نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تم اپنی گھڑی دیکھتے ہو۔ اس میں سوا دس بجے ہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ جلد چلنا چاہیے۔ یہ کام تمھارے شعوری دماغ نے کیا۔ گھڑی دیکھتے وقت تمھیں یہ خیال

نہیں ہوا کہ تم سوا دس یا ساڑھے دس بجے کے خیال سے گھڑی دیکھ رہے ہو۔ لیکن اگر تمھاری گھڑی میں اس وقت چار بجے ہیں تو تم فوراً سمجھ جاتے ہو کہ گھڑی رُک گئی یا خراب ہو گئی ہے۔ گو واقعی طور پر تمھیں خیال نہ گزرا ہو لیکن تمھارا دماغ باخبر ضرور تھا کہ اس وقت سوا دس یا ساڑھے دس کا عمل ہوگا۔ یہ اندازہ تمھارے دماغ میں تھا لیکن شعوری حالت میں نہ تھا۔

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص کی بنیادی خواہش اپنی فوقیت جتانا ہے اور یہ بنیادی خواہش پوری نہیں ہوئی ہے۔ گو اس کی یہ خواہش شعوری حالت میں نہ ہو لیکن اس کی تکمیل وہ اپنی بڑائی جتا کے کرتا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ بڑائی جتانے کا سبب اسی چھپی خواہش کی تکمیل کرنا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ ایک غیر معمولی آدمی ہے مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ اس بنیادی خواہش سے جو اس کی تعلّی کی محرّک ہے وہ باخبر ہو۔ اسی طرح ایک عورت دوسری عورت سے اپنے دکھ درد کو بیان کرتی ہے اور دوسری عورت بھی ساتھ ہی اپنا دکھڑا روتی ہے تو اس کی وجہ بھی دراصل وہی بنیادی خواہش ہے کہ اپنے آپ کو ہر بات میں فائق ثابت کیا جائے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خواہش سے باخبر بھی ہو۔

اِس کتاب کے پڑھنے والے کے لیے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایک شخص ایک خاص احساس اور فعل کے اصل سبب سے اور اپنی بنیادی خواہشات سے بالکل ناواقف رہ سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اسے اس خواہش کا مطلقاً علم نہ ہو جو ایک خاص احساس یا طرزِ عمل سے اپنی تکمیل کر رہی ہے۔ نفسیات کی معلومات کی بنا پر وہ ان خواہشات سے واقف ہو تو ہو ورنہ گمان غالب یہ ہے کہ وہ ان خواہشات سے لاعلم ہی رہے گا۔

جس وقت تک ہماری زبردست بنیادی خواہش کی تکمیل نہ ہو

اس وقت تک ہمیں چین اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ گو ہم کو
معلوم نہ ہو کہ یہ کون سی خواہش ہے لیکن جب تک وہ بر نہ آئے ہم پریشان رہتے
ہیں۔ ہم اندھادھند ہر اُس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے تکمیلِ
مدعا ہو اور اطمینان میسّر آئے۔ ہم کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم اپنی بنیادی
خواہش کی اصل نوعیت سے واقف نہیں ہوتے اس لیے ہماری کوشش اور
ہماری تلاش بے معنی ہوتی ہے۔ ہم چین اور اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہر طرف
شترِ بے مہار کی طرح دوڑتے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ دراصل وہ کون سی خواہش
ہے جس کی تکمیل ہونی چاہیے۔

اکثر لوگ اپنی زندگی کا آدھا حصہ بلاوجہ ناخوشی کے ساتھ گزارتے ہیں جس
کا سبب محض یہ ہے کہ وہ اس سے واقف نہیں ہوتے کہ انھیں مسرّت حاصل
کرنے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ ناخوش ہیں اور انھیں اطمینان حاصل
نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نامعلوم طور پر کسی چیز کے طلبگار رہیں، لیکن چونکہ
وہ اپنی ضرورت اور اپنی خواہش کو نہیں جانتے ان کی آدھی عمر حصولِ مدعا کی
بے معنی کوششوں میں گزر جاتی ہے۔ البتہ اتفاقی طور پر کچھ کوششیں صحیح راستے
پر لگ جاتی ہیں تو بنیادی خواہشات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

نفسیات کا پہلا عملی سبق یہ ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں اور اپنی بنیادی خواہشات
کو سمجھیں تاکہ ان کی فی الواقع تکمیل کی جا سکے۔ نفسیات کا دوسرا سبق یہ ہے کہ ہم
اوروں کی بنیادی خواہشات کو پہچانیں تاکہ ان کے طرزِ عمل اور احساسات کی
تہہ کو پا سکیں۔

جبلّت

جبلّت جسم کا ایک فطری و موروثی رجحان ہے جو خاص حالات میں خاص

طریقے سے عمل کرتا نظر آتا ہے۔ زیادہ صحیح طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جبلّت نظامِ عصبی کا فطری رجحان ہے جو وقتی تحریک کی وجہ سے جسم میں ایک خاص عضوی کیفیت پیدا کرتا اور خاص خاص جسمانی افعال کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً اگر زور کے دھماکے یا ایک بے اختیار دہلا دینے والی چیخ سے ہم چونک جاتے ہیں تو ہمارا جسم ساتھ ہی سخت اور ساکت ہو جاتا ہے یا ہم دہشت سے گُم صُم اور بے دست و پا سے ہو جاتے ہیں۔ یہ حالت ہمارے جسم میں از خود پیدا ہوتی ہے اور اسی کو ہم ڈر کہتے ہیں۔ ہمارے جسم کی یہ حالت ایک جبلّی عمل ہے جس کو بناوٹی بیماری یا دبک جانے کی جبلّت سے موسوم کر سکتے ہیں۔ زمانہ بدویت کی اور بھی کئی ایسی جبلّتیں انسان میں پائی جاتی ہیں جیسے فرار ہو جانے کی جبلّت، حملہ کرنے اور لڑنے پڑنے کی جبلّت، کھانے کی جبلّت، گرم جگہ ٹٹولنے کی جبلّت وغیرہ۔ یہ جبلّتیں بہت سیدھی سادی ہیں۔ دوسری جبلّتیں زیادہ پیچیدہ ہیں جیسے تحقیق اور دریافت کرنے کی جبلّت، محبت کرنے اور جوڑے کے ساتھ رہنے کی جبلّت، پرورش اور نگہبانی کرنے کی جبلّت نقل کرنے کی جبلّت (جس کی وجہ اپنے انوکھے پن کا خیال ہے)، خود نمائی کی جبلّت (جس کی وجہ اپنے نہ پوچھے جانے کا خیال ہے)، دوستی پیدا کرنے کی جبلّت (جس کی وجہ اپنی تنہائی کا خیال ہے) شکار کرنے کی جبلّت وغیرہ۔

یہ تمام جبلّتیں جنگلی آدمی کے لیے کارآمد اور ضروری تھیں۔ جب وہ جنگل میں کسی درندہ جانور کی چنگھاڑ یا اپنے بھائی کی جاں گداز چیخ یا خطرے سے خبردار کرنے والی للکار سُنتا تو بچاؤ کی بہترین صورت یہی تھی کہ وہ اپنی جگہ بالکل خاموش اور بغیر کسی حرکت کے بیٹھا رہے یا بالفاظِ دیگر بناوٹی طور پر بیمار بن جائے۔ لیکن جب دفعۃً کسی چیز کے آدھمکنے سے وہ گھبرا جاتا اور اگر یہ چیز اس پر حملہ بھی کر بیٹھتی تو اس وقت بناوٹی بیماری کی جبلّت سے کام نہیں

چل سکتا تھا ، اس وقت ہمارا جنگلی آدمی اپنے بچاؤ کی صورت جھٹ چھپ جانے یا فرار ہو جانے میں سمجھتا تھا لہٰذا کسی بڑی چیز سے دوچار ہو جانے کی صورت میں اس وقت بھی یہی عمل تھا اور اب بھی ہے کہ پیٹھ پھیر کر فرار ہو جائیں ۔ ایسے موقع کے احساس کا نام دہشت ہے لیکن بھاگنے کا رجحان جبلّت کہلائے گا ۔ یہی حال دوسری جبلّتوں کا بھی ہے ۔ ہر جبلّت قدیم آدمی کے لیے اس کی فطری زندگی کے لحاظ سے ضروری اور کارآمد تھی ۔ بایں ہمہ ہر جبلّی فعل خود بخود سرزد ہوتا ہے ، بالارادہ نہیں ۔ گو جبلّی فعل کا بھی ایک منشا ہوتا ہے لیکن یہ منشا اس شخص کے دماغ میں نہیں ہوتا جس سے وہ فعل عمل میں آرہا ہے ۔ ہم اس امر کو ایک مثال سے واضح کریں گے ۔ بلا شبہ محبّت کرنے اور جوڑے کے ساتھ رہنے کی جبلّت کا منشا اور فائدہ نسل کی ترقی ہے لیکن اس مرد اور عورت کے دماغ میں جو محض بہ تقاضائے جبلّت ایک دوسرے پر وارفتہ ہیں ، یہ خیال ہرگز نہیں رہتا ۔ وہ یہ نہیں سوچتے اور کہتے کہ " نسل کی ترقی ضروری ہے اور اس لیے ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں "۔ حقیقت میں اس جوڑے کی محبّت کی جبلّت " اندھی " ہے ۔ جبلّت کی کارفرمائی کسی منشا کے تحت نہیں ہوتی بلکہ خود جبلّت کی بنا پر عمل میں آتی اور جبلّت پر ختم ہوتی ہے ۔

اصلی جبلّی طرزِ عمل کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ خود بخود اور بلا ارادہ وجود میں آتا ہے اور خیال عقل یا تجربہ یا مثال یا تربیت کا پابند نہیں ہوتا ۔ اس کے سوا دوسرے طرزِ عمل جس قدر بھی ہیں ان کو خالص جبلّی نہیں کہا جائے گا ۔

غیر جبلّی طرزِ عمل

ہر جبلّت کا تعلق ایک بنیادی خواہش اور ضرورت کے ساتھ ہے

(لیکن یہ واضح رہے کہ یہ خواہش ہمارے شعوری دماغ میں ہونا ضروری نہیں) انھیں بڑی بڑی بنیادی خواہشات کو فطرتِ انسانی اپنے اندر لیے ہوئے ہی اور مہذّب و شائستہ اشخاص کے تمام طرزِ عمل کا سرچشمہ آج بھی یہی بڑی بڑی بنیادی خواہشات ہیں۔

فرق یہ ہی کہ ہم مہذّب لوگ اپنی بنیادی خواہشات کو عموماً اصلی جبلّی حالت میں ظاہر نہیں کرتے اور نہ اصلی جبلّی حالت میں ان خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں بلکہ نقالی، تربیت، تجربہ اور عقل سے کام لے کر ہم اپنی بنیادی خواہشات کی تکمیل مختلف غیر جبلّی طریقوں سے کرتے ہیں۔

جان کو خطرے سے بچانے کی بنیادی خواہش ہم میں موجود ہی۔ ایک بڑی جسامت والی چیز کے دفعتہً ہمارے سامنے آ دھمکنے پر ہماری اصلی جبلّی حرکت یہ ہوگی کہ دہشت زدہ ہو کر بھاگ جائیں۔ فرض کرو کہ ہم موٹر چلاتے ہوئے ایک بہت زور و شور سے آتی ہوئی ایکسپریس سے ریل کی پٹری پر دوچار ہو جائیں۔ اس وقت ہمارا فوری عمل یہ ہوگا کہ موٹر کو روکیں لیکن ہمارا یہ عمل جبلّی نہیں بلکہ یہ وہ عمل ہی جس کو ہم نے تربیت، تجربہ اور عقل سے سیکھا ہی۔ ممکن ہی کہ ایسا کرتے ہوئے ہمارا جسم وحشی انسان کی اصلی جبلّت سے بھی کام لے اور دہشت زدہ ہو کر بھاگ جانا چاہے۔ اس صورت میں ہم اپنے جسم کو ایسا عمل کرتا دیکھیں گے اور ہمیں وہ احساس بھی ہوگا جسے "دہشت" کہتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارا موٹر روکنے کا فعل جو تربیت و عقل کی وجہ سے ہوا، دراصل ہماری بھاگ جانے کی قدیم جبلّت کا قائم مقام ہی۔

تمام غیر جبلّی طرزِ عمل یا تو اصلی جبلّی طرزِ عمل کی ترقی یافتہ

صورت ہیں یا ان کے قائم مقام۔

مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں ایک دو مثالیں اور بیان کریں گے۔
ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص سے بگڑ بیٹھتا ہے تو بجائے اس پر پل پڑنے کے (جو جبلی فعل ہے) وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے دوستوں میں اس کی ہتک کرے یا اس کے مقاصد میں رخنہ اندازی کرے یا اس کے احساسات کو صدمہ پہنچائے یا کسی اور طریقے سے اس کو زک دے۔ اسی طرح اگر ایک عورت کسی دوسری عورت سے برہم ہو جائے تو اس پر دست درازی کرنے اور جھپٹ کر آنکھیں نکالنے کے بجائے (جو جبلی فعل ہے) ممکن ہے محض اس پر تہمتیں تراش کر بدنام کرتی پھرے اور اس طرح اپنا غصہ نکالے۔ اسی طرح ممکن ہے پرانی جبلت کے مطابق اکڑ اکڑ چلنے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے بجائے آج کل کوئی شخص اس طرح شہرت حاصل کرے کہ کونسل کی رکنیت کے لیے کھڑا ہو جائے یا آبشار نیاگرا پر ایک پیپے میں بیٹھ کر نیچے اُترے۔

ہر بنیادی تحریک یا خواہش ابتدا میں جبلت ہی کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے لیکن نقالی، تربیت، تجربہ اور عقل سے ہم نے اپنی خواہش کے اظہار اور اس کی تکمیل کے دوسرے طریقے پیدا کر لیے ہیں۔

اِس کتاب کے حصۂ دوم میں ہم ابتدائی انسانی خواہشات پر بحث کریں گے اور جبلت کو نظر انداز کر کے ہر خواہش کے اظہار کے مختلف طریقوں میں سے چند طریقوں کا ذکر کریں گے۔ اس سے ہم کو اس بنیادی خواہش کا اندازہ لگ جائے گا جو ایک شخص کے احساسات، طرزِ عمل اور اغراض کی تہ میں

کام کرتی ہے۔ حصّۂ سوم میں ہم بتائیں گے کہ کس طریقے سے ایک بنیادی خواہش ایک شخص میں ایک خاص صورت سے ظاہر ہوتی ہے اور وہی بنیادی خواہش دوسرے شخص کی زندگی میں کس طرح بالکل دوسرا پیرایہ اختیار کرتی ہے۔ دو **شخصوں کے کردار میں فرق کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں نے اپنی بنیادی خواہشات کی تکمیل کے لیے مختلف غیر جبلّی طریقے اختیار کیے ہیں۔**

ہم اپنے یا کسی دوسرے شخص کے کردار کو بدل سکتے یا اس کی اصلاح کر سکتے ہیں، اپنی یا دوسرے شخص کی بُری عادتوں کو توڑ سکتے اور ناپسندیدہ طرزِ عمل کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ نیز ایک شخص پر اپنا اثر قائم کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی بنیادی خواہش اس کردار یا طرزِ عمل کی تہ میں کام کر رہی ہے جس کی ہم اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔ جب یہ معلوم ہو تو اس بنیادی خواہش کے اظہار اور تکمیل کے لیے کسی دوسرے راستے کی رہ نمائی کی جا سکتی ہے۔

بجز غیر معمولی طبائع کے ہم سب کی بنیادی خواہشیں مشترک ہوتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہر شخص میں یہ بنیادی خواہشیں لازمی طور پر ایک ہی پیمانے پر ہیں۔ ایک پیمانے پر یہ نہیں ہوتیں لیکن ہر شخص میں پائی ضرور جاتی ہیں۔ یہ خواہشیں بذاتِ خود اچھی ہیں نہ بُری بنیادی خواہشات میں کوئی بُرائی یا بھلائی نہیں ہوتی بلکہ بُرائی یا بھلائی اس خاص طریقے میں ہوتی ہے جس کے ذریعے سے وہ ظاہر ہوتی ہیں۔

بچوں کی تربیت کے وقت یا سامان کی فروخت یا نوکری کی جستجو کی صورت میں یا کسی شخص کے احساسات یا طرزِ عمل کو کسی طریقے سے متاثر کرنے کے لیے ہمارا طریقۂ عمل یہ ہونا چاہیے کہ کسی جدید طریقے کی طرف رہ نمائی سے

اپنے مخاطب کی بنیادی خواہش کی تکمیل کریں ۔ زندگی مسرت کے ساتھ گزارنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ہماری تمام بنیادی خواہشیں مستحسن طریقے سے ظاہر ہو کر پوری ہو رہی ہیں اور جس طریقے سے ان کا اظہار ہو رہا ہے وہ دوسرے لوگوں یا قوم کے لیے ضرر رساں نہیں ہے ۔



حصّہ دوم

ہماری بنیادی خواہشات

ذیل میں بنیادی موروثی خواہشات کی ایک فہرست دی گئی ہے جو تمام مرد و عورت میں مشترک ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر بنیادی خواہش (ہر فرد بشر کی زندگی میں) کسی نہ کسی ابتدائی جبلت پر مبنی ہوتی ہے لیکن مثال، تجربہ، تربیت اور عقل سے استفادہ کر کے دوسرے غیر جبلتی طریقوں سے ہم ان خواہشات کو ظاہر اور پورا کرتے ہیں۔

دو شخصوں کے درمیان فرق کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بنیادی خواہشات کے اظہار اور تکمیل کی مختلف راہیں انھوں نے اپنی زندگی میں اختیار کی ہیں۔

بنیادی خواہشات بذاتِ خود بُری یا بھلی نہیں ہیں۔ بُرائی یا بھلائی اس خاص طریقے میں ہوتی ہے جس کے ذریعے ان کی تکمیل ہوتی ہے۔

حصّہ سوم میں ہم دیکھیں گے کہ مختلف انفرادی کردار کس طرح بنتے ہیں اور بچپن اور بعد کے زمانے میں ان بنیادی خواہشات کو مختلف صورتوں سے پورا کرنے کی وجہ سے کیوں کر مختلف طریقوں سے ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔

بنیادی موروثی خواہشات

نشانِ سلسلہ	ابتدائی جبلت	خواہش	متعلقہ احساس
۱	تمام معمولی اور سادی جبلتیں پکڑنا، کھانا پینا، سونا، دوڑ دھوپ کرنا، گرم جگہ ٹٹولنا وغیرہ	جسمانی راحت	بھوک، سردی، بے چینی، نیند کی خواہش
۲	بناوٹی بیماری	اپنی حفاظت	گم صم کر دینے والا خوف
۳	بھاگ جانا	خطرے سے بچنا	اضطرابی خوف
۴	عاجزی، منّت	اس شخص کی رضا جوئی جو نقصان پہنچا سکتا ہو اور اس کے دل میں اپنی جگہ کرنا۔	انکسار اور غلامی، دوسرے کی رضاجوئی اور اس کے دل میں جگہ کرنے کی خواہش۔
۵	اپنی طرف متوجہ کرنا اور اظہارِ نمائش	(۱) اپنی طرف اپنے ہم جنسوں کی توجہ منعطف کرانا (۲) ان کی تحسین حاصل کرنا اور ان کے دل میں گھر کرنا	خودنمائی، اپنے آپ کو لیے پھرنا اور پسندیدہ نگاہوں سے دیکھے جانے اور چاہے جانے کی خواہش۔
۶	حملہ کرنا اور گلتھب ہو جانا	(ا) تکلیف دینا اور نقصان پہنچانا	(ا) غصہ، دشمنی اور نفرت

نشان سلسلہ	ابتدائی جبلّت	خواہش	متعلقہ احساس
		(ب) غالب ہونا اور حکومت کرنا	(ب) غالب ہونے کی خواہش
		(ج) اپنے آپ کو برتر سمجھنا	
۷	محبّت کرنا اور جوڑے کے ساتھ رہنا	جنس مخالف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا، اس کو خوش کرنا اور اس کے ساتھ رہنا۔	راغب کرنے اور خوش کرنے کی خواہش، اشتیاقِ الفت
۸	خبرگیری و محافظت	کسی کی خبرگیری اور محافظت کرنا (مثلاً بچے کی یا رفیق کی) جو نسبتاً کمزور ہی۔	شفقت اور محافظت
۹	سنگت کی تلاش	اپنے ہم جنسوں کی صحبت اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا	تنہائی، بے کسی
۱۰	اپنے ہم جنسوں کی نقل کرنا	اپنے گروہ خصوصاً اس کے سربرآوردہ لوگوں کی مانند رہنا	(ا) استعجاب (ب) اپنے انوکھے پن کا احساس

نشان سلسلہ	ابتدائی جبلت	خواہش	متعلقہ احساس
۱۱	صید و شکار	پکڑنا اور گرفتار کرنا	احساسِ شکار
۱۲	دریافت و تحقیق	پتہ چلانا، معلوم کرنا اور سمجھنا	کھوج
۱۳	جان پہچان والوں کی طرف جانا۔	جانے پہچانے لوگوں، دیکھے بھالے مقامات اور حالات کی طرف رجوع ہونا	دل بستگی، وطن لوٹنے کا اشتیاق، قدامت پسندی وغیرہ

صحیح مرد اور عورت کی بنیادی خواہشات

(جو سہولت کے لیے حسبِ ذیل طور پر درج کی جاتی ہیں)

(۱) جسمانی راحت (۲) اپنی حفاظت (۳) خطرے سے بچنا (۴) اس شخص کی رضا جوئی جو نقصان پہنچا سکتا ہو اور اس کے دل میں اپنی جگہ کرنا (۵) اپنی طرف اپنے ہم جنسوں کی توجہ منعطف کرانا، ان کی تحسین حاصل کرنا اور ان کے دل میں گھر کرنا (۶) (ا) تکلیف دینا اور نقصان پہنچانا (ب) غالب ہونا اور حکومت کرنا (ج) اپنے آپ کو برتر سمجھنا (۷) جنسِ مخالف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا، اس کو خوش کرنا اور اس کے ساتھ رہنا (۸) کسی کی خبر گیری اور حفاظت کرنا (مثلاً بچے کی یا رفیق کی) جو نسبتاً کمزور ہو (۹) اپنے ہم جنسوں کی صحبت اور ان کی ہمدردی حاصل کرنا (۱۰) اپنے گروہ خصوصاً اس کے سربرآوردہ لوگوں کی مانند رہنا (۱۱) پکڑنا اور گرفتار کرنا (۱۲) پتہ چلانا، معلوم کرنا اور سمجھنا (۱۳) جان پہچان والے لوگوں، دیکھے بھالے مقامات اور

حالات کی طرف رجوع ہونا۔

ان خواہشات کی تکمیل

ہمارے خیال میں خواہشات کی جو فہرست اوپر دی گئی ہے وہ تمام انسانوں کی جملہ بنیادی خواہشات پر حاوی ہے۔

بلاشبہ یہ خواہشات (یا محرکات) ہر شخص میں ایک ہی پیمانے پر نہیں ہوتیں۔کسی خاص خواہش کی کسی شخص میں زیادتی یا کمی کچھ تو اس شخص کی جسمانی حالت پر موقوف ہوتی ہے اور کچھ اس کے گزشتہ تجربات پر جن کی وجہ سے ان میں کمی یا بیشی ہونا ضروری ہے۔ان کے سوا دوسری خواہشات وہ ہیں جو پیدا کردہ اشتہاؤں (جیسے تمباکو) اور عادتوں سے وجود میں آتی ہیں۔

ہم میں سے ہر صحیح شخص میں ان خواہشات کا ہونا ضروری ہے اور ہم خوش اسی وقت رہ سکتے ہیں جبکہ یہ کم و بیش پوری ہوں۔

آیندہ صفحات میں ہم ان مختلف طریقوں میں سے چند کا ذکر کریں گے جن کے ذریعے ہر خواہش اپنے آپ کو ظاہر اور تکمیل مدعا کرتی ہے۔لیکن یہاں مناسب ہوگا کہ فہرستِ ماسبق پر ایک نظر پھر ڈال لی جائے اور معلوم کیا جائے کہ تم خود اپنی زندگی میں اپنی ہر بنیادی خواہش کو کس طریقے سے پورا کر رہے ہو یا پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔

اگر تمھاری شادی ہو چکی ہے تو اس امر پر غور کرنا تمھارے لیے باعثِ دلچسپی ہوگا کہ تمھاری بیوی کس طریقے سے ان بنیادی خواہشات کو پورا کر رہی ہے یا تمھارا شوہر کس طریقے سے۔اور تم خود ان کی تکمیل خواہشات میں کس قدر حصہ لے رہے ہو۔تمھاری شادی کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اسی ایک چیز پر ہے۔

اگر تمھارے بچّے ہیں تو ہر بچّے میں بھی یہی بنیادی خواہشات ہوتی ہیں اور اس کو بھی کسی نہ کسی طریقے سے ان کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ کیا ہر خواہش کی تکمیل کے لیے کسی مناسب طریقے کی تکمیل کی طرف تم نے اس کی رہنمائی بھی کی ہے یا نہیں؟

بچّوں کے کھیل

اِس کتاب کو پڑھنے والا شخص جس کو بچّوں سے دلچسپی ہو، جبلّت اور بنیادی خواہشات کی فہرست کو پھر اچھی طرح سے پڑھے۔ اس کو معلوم ہوگا کہ ہر بنیادی خواہش (باستثنائے جنس) بچّوں میں بھی ہوتی ہے جسے وہ مختلف کھیلوں کے ذریعے ظاہر اور پورا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بچّے اپنے کھیل سے خوش ہوتے ہیں۔ بچّوں کے کھیلوں کی ایک فہرست بناؤ اور معلوم کرو کہ کون سی جبلّی خواہشات کس بچّے کی دل بہلائی کا ذریعہ ہیں۔

مذہب

معلوم کرو کہ ان بنیادی خواہشات میں سے کتنی اور کون سی بنیادی خواہشات مذہب کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہو کر پوری ہوتی ہیں۔

شادی

کتنی اور کون سی خواہشات خوش گوار تعلقات محبّت یا شادی کے ذریعے پوری ہوتی ہیں۔ تمھاری کتنی خواہشات شادی کے ذریعے پوری ہو رہی ہیں اور تمھارے شوہر، تمھاری بیوی اور تمھاری محبوبہ کی کتنی خواہشات تمھارے ذریعے سے پوری ہو رہی ہیں۔

دعویٰ

کوئی انسانی خواہش یا فعل ایسا بھی ہے جو تمہارے خیال میں ایک یا ایک سے زاید بنیادی خواہشات کا مظہر نہیں۔ کوئی انسانی خواہش یا فعل ایسا نہیں ہے۔ تمہاری ہر خوشی کا سبب ان بنیادی خواہشات میں سے کسی ایک یا ایک سے زاید خواہشات کی تکمیل ہے۔

خوف

کیا تم کبھی دہشت زدہ ہوئے ہو؟ اگر ہوئے ہو تو اب اُس وقت کو یاد کرو۔ غالباً تم ریل میں سفر کر رہے تھے اور تمہارا ڈبّا پٹڑی پر سے اُتر گیا۔ یا تم ایک کھیت میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ یکایک ایک بیل کا سامنا ہو گیا جو تم پر حملہ کرنے کو تھا۔ یا شاید تم موٹر میں جا رہے تھے کہ یکایک تمھیں معلوم ہوا کہ موٹر کی ٹکر سے تمہارے پرخچے اُڑ جائیں گے۔ یا تم ایک چھوٹی سی کشتی میں طوفانی دریا میں بہے چلے جا رہے تھے۔ یا کسی زمانے میں تم بھوت پریت کے وجود کو تسلیم کرتے تھے اور ایک وقت ایک شکل یکایک تمہارے سامنے آ موجود ہوئی یا تم نے ایک آواز سُنی جس کو تم بھوت کی شکل یا اس کی آواز سمجھے۔ یا کسی زلزلے کی وجہ سے تم دہشت زدہ ہو گئے۔ اگر سپاہی ہو تو دل کو پاش پاش کرنے والی جنگ کی اس گھڑی کو یاد کرو جبکہ گولہ سائیں سائیں کرتا ہوا تمہاری ہی طرف آتا ہوا تم کو معلوم ہو رہا تھا۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ریل کی پٹڑی پر سے گزر رہے تھے کہ یکایک ریل گاڑی سے تم دوچار ہو گئے۔ جب ان میں سے کوئی بات بھی تمھیں پیش نہیں آئی ہے تو ہمارا روئے سخن اس کتاب کو پڑھنے والی عورت

کی طرف ہی ممکن ہے موودی خانے میں رات کے وقت تم گئیں اور چوہے سے ڈر گئیں (اور کوئی عورت چوہے سے ڈر جائے تو ہمیں ہنس کر اپنی سنگ دلی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے ۔بعض اوقات یہی ڈر اُس کے لیے یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ شیر کی خالہ نہیں ہے)۔

خیر مذاق کو چھوڑو اور اس واقعہ کو یاد کرو جبکہ تم سونی سڑک دہشت زدہ ہو گئے تھے ۔اس وقت تمھاری کیا حالت ہوئی تھی ؟ غالباً تم دفعتاً رُک گئے اور تم کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تمھاری سانس بھی سینے میں بند ہے ۔ نہ صرف سانس ہی بلکہ دل بھی حرکت کرنے سے رُک گیا ہے اور تمھارے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اور چند یا برف جیسی سرد پڑ گئی تھی ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر کے بال کھڑے ہوگئے ہیں ۔ تمھاری قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی ۔ تم مدد کے لیے پکارنا چاہتے تھے مگر تمھاری آواز نہیں نکلتی تھی ۔ تم اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے اور تمھارا یہ عالم تھا کہ گُم صُم بے جان بت بنے ہوئے کھڑے تھے گویا خوف نے تم میں ایک انجمادی کیفیت پیدا کر دی تھی اور تم بالکل مفلوج ہو گئے تھے۔

خوف کی عموماً دو قسمیں ہیں ۔ یہ تو خوف کی ایک قسم تھی جو اوپر بیان کی گئی ۔کیا ایسا ہی خوف تم پر طاری ہوا تھا اور کیا اس خوف کی پوری تصویر کھینچی گئی ہے ؟ اگر کھینچی گئی ہے تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوف کیوں پیدا ہوا تھا ۔ یہ دراصل خطرے سے بچنے کی کوشش تھی اور تم دو قدیم خالص جبلی طریقوں میں سے ایک جبلی طریقے کو اختیار کر کے اپنی سلامتی کے طلب گار اور بناوٹی طور پر مردہ بن گئے تھے ۔ قدرتی طور پر دشمنوں سے بچنے کا یہی طریقہ ہے اور نہ صرف آدمی بلکہ جانور بھی دشمنوں سے بچنے کے لیے اسی طریقے سے کام لیتے ہیں اور خطرے کا اشارہ پاتے ہی وہ بھی اپنی جگہ بالکل بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں ۔ تم نے بھی خطرے کے وقت اسی عمل سے کام لیا ۔تمھارے

اس تاثّر کو خوف کہتے ہیں اور یہ خوف کی ایک شکل ہے۔

خطرے سے اس طرح سے بچنے کی کوشش انسان کے بالکل ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتی ہے اور خالص جبلی ہے۔ اب ہم خطرے سے بچنے کے لیے یہ حربہ نہیں استعمال کرتے۔ بچنے کی خواہش جیسی پہلے ہم میں تھی اب بھی ہے لیکن بچنے کے طریقے مختلف ہیں۔ اپنی جگہ بت بن کر کھڑے رہنے کی بجائے ہم اب عقل سے کام لیتے ہیں۔ اگر جہاز ڈوب رہا ہے تو ہم اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے ربڑ کا تسمہ باندھ لیتے ہیں۔ اگر کوئی درندہ جنگل میں ہم پر حملہ کر بیٹھتا ہے تو خطرے سے بچنے کے لیے اب ہم بے جان بن کر نہیں کھڑے رہتے بلکہ اس کو اپنی بندوق کا نشانہ بناتے ہیں۔ اگر کوئی شخص زاید اوقات میں محنت کرکے روپیہ پس انداز کر رہا ہے تاکہ آیندہ ضرورت پر کام آئے تو یہ بھی ایک قسم کا خوف ہے جو اس شخص کو آیندہ زندگی کے متعلق لگا ہوا ہے۔

ان مثالوں سے ہم یہاں یہ اچھی طرح واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ابتدائی جبلّت کے علاوہ وہی بنیادی خواہش ہزار قسم کے طرزِ عمل میں پائی جاتی ہے اور نفسیات کو سمجھنے کے لیے پہلے اس چیز کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔

بچپن کے خوف

یقیناً یہی چار چیزیں ایسی ہیں جو خلقی اور جبلی طور پر ہمارے خوف کا باعث ہیں۔ اوّل کسی بڑی چیز کا یکایک ہمارے سامنے آ دھمکنا جسے دیکھ کر ہم قدرتی طور پر ٹھٹکنے یا بھاگ جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ دوم ایک اچانک طور پر دھماکے کی آواز جو ہم میں خوف کے مارے گُم صُم کر دینے والی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ سوم خطرے سے خبردار کرنے والی ناگہانی چیخ جس کو سُن کر ہم خوف کے مارے

بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں۔ چہارم جسم کا کسی آفت میں مبتلا ہو جانے کا احساس یا اپنے گر جانے کا خوف جو ایک شیرخوار کو بھی پکڑ لینے اور رونے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہیں کہ اس چار قسم کے فطری خوف کا تعلق وحشی آدمی کے ان زبردست خطرات سے ہے جن میں وہ اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتا تھا۔ دوسرے تمام خوف فطری نہیں ہیں بلکہ ہر آدمی کے ساتھ اس کی اپنی زندگی میں مثال، معلومات، یا ذاتی تجربے کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔

اندھیرے سے ڈرنا جبلی نہیں نہ موت سے ڈرنا اور نہ فوق الفطرت امور سے ڈرنا جبلی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ کسی نہ کسی خوف میں مبتلا رہتے ہیں جو اکثر و بیشتر محض وہم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب بھی اکثر بے وقوف ماں باپ اپنے بچّوں کو چڑیل، بھوت پریت، موت، ہوّا "کالے دیو" اور کیا کیا خرافات سے ڈراتے ہیں۔ یہ خوف جب ان بچّوں کے دماغ میں جڑ پکڑ لیتا ہے تو ان کی دماغی زندگی آگے چل کر بالکل ناکارہ ہو جاتی ہے۔ یہ بچّوں کو رام کرنے کا ایک طریقہ ہے اور گو اس طریقے سے بچّے آسانی کے ساتھ چپکے ہو جاتے ہیں لیکن اس سے بدتر طریقہ رام کرنے کا نہیں ہو سکتا۔

بچّے خود بھی ناسمجھی سے تقلید کی بنا پر بہت سے بے بنیاد خوفوں کا شکار رہتے ہیں۔ اگر ماں اندھیرے سے ڈرتی ہے یا موت سے یا مینڈک سے یا گائے بھینس سے یا بھوت پریت سے تو اس کو کم از کم اتنی احتیاط ضرور کرنی چاہیے کہ اس کے بچّے اُس کے اِس ڈر سے واقف نہ ہوں۔

نمایش اور پسندیدگی کی خواہش

کیا تم اظہارِ نمایش کو پسند کرتے ہو اور کیا یہ چاہتے ہو کہ لوگ تمھیں پسندیدہ

نظروں سے دیکھیں ؛ فرض کرو کہ تم بازار سے گزر رہے ہو جہاں تمھیں جان پہچان کے لوگ ملتے ہیں جو تم کو دیکھ کر بھی کترا کے چلے جاتے ہیں۔ اس وقت تمھیں کچھ کوفت تو نہیں ہوئی ؟ اور کیا تم نے اپنا نام غلط لکھے یا غلط بولے جانے پر اثر تو نہیں لیا ؟ اور کیا کسی مجلس میں تمھیں یہ خیال نہیں گزرا کہ تمھاری خاطر خواہ آؤ بھگت نہیں ہو رہی ہے اور کیا یہ بات تمھیں بُری معلوم نہیں ہوئی ؟ یا جب تم کسی سے گفتگو کر رہے ہو اور تمھیں دفعتًہ معلوم ہوتا ہے کہ تمھارا مخاطب تمھاری گفتگو کو نہیں سُن رہا ہے تو کیا تم ناراض نہیں ہوئے ؟

یہ سب تم کیوں محسوس کرتے ہو؟ یہ محض اس لیے کہ تم چاہتے ہو (گو تمھیں اس کا مطلق علم نہ ہو) کہ لوگ تمھیں دیکھیں۔

اگر ایسا ممکن ہو کہ ایک آدمی کو سوسائٹی میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور کوئی اس کی طرف مخاطب نہ ہو تو اس سے زیادہ کوئی شیطانی سزا نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص مجلس میں ہمیں نہ دیکھے اور ہماری بات کا جواب نہ دے اور ہمارے نیک و بد سے کوئی سروکار نہ رکھے بلکہ جو شخص بھی ہمیں دیکھے وہ ہم سے منہ پھیر کر چلا جائے اور اس طرح سے پیش آئے گویا ہمارا وجود اور عدم وجود برابر ہے تو یقینًا ہم غصّے سے جلد بھڑک اٹھیں گے اور یہ نہیں تو ایک عالمِ مایوسی ہم پر ضرور طاری ہو جائے گا۔

اب پسندیدگی کی خواہش کو لو۔ بھلا اگر کسی دو آدمیوں کو اتفاقی طور پر اپنے متعلق باتیں کرتے ہوئے سُن لیا تو تم کس قسم کی گفتگو سے خوش ہو گے۔ شکایتی یا تعریفی؟

اپنے آپ کو بتانے کی خواہش اور اپنی طرف متوجہ کرنے کا خیال چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں حتیّٰ کہ شیرخوار بچّوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد پسندیدگی سے دیکھے جانے کی خواہش بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اس خواہش کو ابھارا جائے تو وہ پھلتی پھولتی ہے اور اگر ابھارا نہ جائے تو ممکن ہے کہ پھر وہ نہ اُبھرے

لیکن صحیح و تندرست آدمیوں میں کمی یا بیشی کے ساتھ تمام عمر رہتی ہے۔ یہ انسان کی اُن بڑی بنیادی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے جو اس کے خیالات، اس کے محسوسات اور اس کے طرزِ عمل پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ ہر بنیادی خواہش کی طرح اپنے آپ کو دکھانے اور پسندیدہ نظروں سے دیکھے جانے کی خواہش بذاتِ خود اچھی ہے اور نہ بُری۔ بُرائی یا بھلائی اُس خاص طریقے میں ہے جس کے ذریعے سے اس خواہش کو پُورا کیا جاتا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ہی جنس کے لوگ ہمیں دیکھیں اور پسند کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک حد تک سب انسان ہمارے ہی ہم جنس ہیں لیکن بہ نسبت عام لوگوں کے ہمارے ہی جیسے لوگوں میں پسندیدہ نظر سے دیکھے جانے کی خواہش ہم میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مدرسے کا لڑکا اپنے اُستادوں کی پسندیدگی سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا اپنے ہم سبق لڑکوں کی پسندیدگی سے۔ ایک کامیاب مجرم اس لحاظ سے کہ اس کی زندگی کا تعلق جرائم پیشہ طبقے سے ہے عزت دار اور قانون کی پابندی کرنے والے لوگوں کی قدر و منزلت کی اتنی پروا نہیں کرتا جتنی اپنے طبقے کے لوگوں کی۔ جنگ کے مخالف کو صلح کے حامیوں کی تحسین و آفرین سے جس قدر خوشی ہوتی ہے اُس قدر رنج جنگ کے طرف داروں کی تحقیر سے نہیں ہوتا۔ مسکرات کے خلاف تقریر کرنے والا ان لوگوں کے طعن و تشنیع کی کوئی پروا نہیں کرتا جو مسکرات کا دھندا کرتے ہیں بشرطیکہ اس کو ترکِ مسکرات سے تعلق رکھنے والوں کی تائید و تحسین حاصل ہو۔ ہر مرد اور ہر عورت اپنے ہی ہم جلیسوں کی رائے کی زیادہ پروا کرتی ہے۔

درحقیقت ہمارے اندر اپنے ہی طبقے اور اپنی ہی جماعت کی اچھی رائے حاصل کرنے کی خواہش ایک ایسی زبردست اور مستحکم خواہش

ہی جو ہمارے خیالات ، ہمارے جذبات اور ہمارے طرزِ عمل کو متاثر کرتی ہے اور یہی وہ خواہش ہے جس کی وجہ سے دنیا کے اکثر بہترین اور بدترین کام وجود میں آتے ہیں۔

اس خواہش کو ایک حد تک پورا کرنے کے لیے ہم اپنی اس جنس سے محبت کرتے ہیں جو ہم میں دلچسپی لیتی اور ہماری تحسین و آفرین کرتی ہے۔ ہم دکھاوے کی خاطر اور تحسین حاصل کرنے کے لیے عمدہ لباس پہنتے ہیں یا عمدہ لباس پہننے پر ناز کرتے ہیں یا ٹینس یا فٹ بال یا اور کھیلوں میں بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں یا ایسے لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں جو کسی نہ کسی حیلے بہانے اخبارات میں اپنے نام سے خطوط روانہ کرتے ہیں۔ یہی دکھاوے اور تحسین کی غیر شعوری خواہش ہمیں مذہبی واعظ یا ایکٹر یا مدرس بننے یا سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی کی وجہ سے ہم گفتگو زیادہ آواز سے کرتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہم بجیٹر کے ڈبے پر کھڑے ہو کر سیاسیات کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور اسی کی وجہ سے سڑک کی روشنی کے کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر اخلاق پر پند و موعظت کا دفتر کھولتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہم ایک بیش قیمت موٹر خریدتے ہیں اور اسی کی وجہ سے ہم ہر ایک سے اپنے دکھ درد اور بیماریوں کا حال کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنا نام اخبارات میں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے ہیں یا غیر شعوری طور پر شہرت کی طلب میں مذہبی، سیاسی یا مزدور پیشہ جماعت یا اپنی سوسائٹی میں ممتاز حیثیت حاصل کرتے ہیں تو یہ تمام باتیں اسی خواہش کا نتیجہ ہیں۔ اس خواہش سے ہم کو پشیمان نہ ہونا چاہیے۔

یہ خواہش اور دوسری بنیادی خواہشات کی طرح بذات خود نہ اچھی ہے نہ بری۔ یہ خواہش ہم سے اچھے اور مفید کام بھی کرا سکتی ہے اور برے

اور مضرت رساں کام بھی۔ بُرائی یا بھلائی بنیادی خواہش میں نہیں ہے لیکن اس خاص طریقے میں ہے جس کے ذریعے یہ پوری ہوتی ہے۔

غصّہ وغضب

کیا تم کبھی غصّے میں آپے سے باہر بھی ہوئے ہو؟ جب تم غصّے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہو تو کون سے احساسات اس وقت تم میں ہوتے ہیں؟ تم محسوس کرتے ہو کہ تمھارا دل مسوسا گیا ہے، تمھاری سانس تیز تیز چلتی ہے، تمھاری آنکھوں سے شعلے نکلتے ہیں، تمھارا مُنہ مضبوطی سے بند ہوتا ہے، تمھاری مُٹھیاں بھی مضبوطی سے بند رہتی ہیں، تمھاری بھویں تن جاتی ہیں، نہ صرف بھویں بلکہ تمھارے جسم کے تمام عضلات تن جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمھارے سر میں خون کا دوران زیادہ ہو جائے اور تم کو تمام چیزیں سُرخ نظر آئیں۔ تم یہ بھی محسوس کرتے ہو کہ تمھارا تمام جسم اینٹھ گیا ہے، تم پر رعشہ طاری ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم سے ایک آگ نکل رہی ہے جو تمھیں اپنے حریف سے گھ جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس تمام عرصے میں تم دیکھتے ہو کہ تمھارا دل قابو میں نہیں ہے اور تمھاری سانس اُکھڑی چل رہی ہے۔ یہ تمھارے اُس وقت کے احساسات میں جبکہ تم جذبے میں آپے سے باہر ہو جاتے ہو۔ معمولی غصّے کی حالت میں یہ علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ یہ علامات ظاہر کرتی ہیں کہ تمھارے اندر ایک ہیجان برپا ہے اور تم کسی خاص امر کے لیے کوشش کر رہے ہو۔ یہ تمام احساسات (بالفاظِ دیگر غصّہ) جو تم پر طاری ہوتے ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تم لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو رہے ہو۔ مسوستا دل، اُکھڑی ہوئی سانس، آنکھوں سے شعلوں کا نکلنا، مُنہ کا مضبوطی سے بند ہونا، بند مٹھیاں، اینٹھے ہوئے عضلات، یہ تمام باتیں اور اور بعض ایسی باتیں جو یہاں

بیان نہیں کی گئیں ، تم غصّے کی حالت میں محسوس کرتے ہو جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ تم فطری طور پر اپنے دشمن پر حملے کی تیاری کر رہے ہو - یہ ایک دوسری جبلت ہی جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہی اور یہ لڑائی کی جبلت ہی -

لڑائی کی جبلت جب مشتعل ہو جاتی ہی تو غصّے کے احساس کے ساتھ حملہ کرنے ، نقصان پہنچانے ، مارنے ، زک دینے اور فرماں بردار بنانے کی خواہش بھی پیدا کرتی ہی - فطری حالت میں یہ خواہش اسی وقت پوری ہوتی ہی جب دشمن کا خاتمہ ہو جائے -

طبعی لحاظ سے یہ خواہش خاص عضوی کیفیت پر مشتمل ہوتی ہی - نظامِ عصبی کے بعض مقامات میں ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہی جو جمع شدہ عصبی قوّت کو کسی حرکت کے ذریعے سے خرچ کرنے پر ہی دور ہو سکتا ہی - جگر سے شکر کی ایک کثیر مقدار خون کی نالی میں دوڑ جانے سے کسی غضب ناک حرکت کے کر بیٹھنے پر ہم تیار ہو جاتے ہیں - ہاضمے کا فعل بالکل موقوف ہو جاتا ہی - خون میں ایڈرنالن (Adrenalin) کی زاید مقدار ہوتی ہی جو پیش آنے والی کشمکش میں جس کے لیے جسم تیار ہو رہا ہی ، جسم کو صدمہ پہنچنے کی صورت میں خون کو بہنے سے روکتی ہی - جسمانی لحاظ سے یہ خواہش جسم کی اُس ضرورت پر مبنی ہوتی ہی کہ زاید قوّت کو خارج کرے اور اس زاید نشاستہ کو جو جگر میں ہوتا ہی خرچ کر کے اعتدالی حالت پر رجوع ہو -

(یہ ہم نے بیان کیا ہی کہ غصّے کی حالت میں چوں کہ ہاضمے کا فعل بند ہو جاتا ہی اس لیے غصّے کی حالت میں کھانا کھانا مناسب نہیں ہی - اگر ہم کھانا کھائیں گے تو غالباً وہ ہضم نہ ہوگا) -

غصّے سے بھڑک اُٹھنے کے بعد (یعنی لڑائی کی جبلت مشتعل ہو جانے پر)

ہماری ہیجانی حالت اس وقت تک کم نہیں ہوتی جب وقت تک زاید قوت خارج اور زائد نشاستہ صرف نہ ہو جائے۔ اس کے لیے بہترین صورت تو یہی ہے کہ تیز مشی کے لیے باہر نکل جائیں یا کدال لے کر باغ میں کھودنے کا کام کریں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو غصے کی حالت میں ہم کئی گھنٹے رہیں گے اور ممکن ہے کہ اس حالت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ہم کسی دوسرے شخص سے اُلجھ جائیں۔ سب جانتے ہیں کہ ایک شخص اپنے دفتر میں مشتعل اور برہم ہو کر گھر آتا ہے تو کس طرح اپنی برہمی کو اپنی بیوی یا اپنے بچوں یا اپنے کُتے پر نکالتا ہے۔

نفرت، دشمنی اور عناد

اس خواہش کو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ کس طرح یہ ابتدائی اور خالص جبلی حالت میں غصے یا قہر کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ جسمانی اعتبار سے نفرت غصے کی ایک ہلکی لیکن قائم رہنے والی صورت ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ نفرت مختص ہوتی ہے اور غصہ کسی قدر عمومیت لیے ہوئے ہے۔ جب ہم غصے کی حالت میں ہوتے ہیں تو ذرا سا بھی بہانہ ملنے کی صورت میں ہم کسی شخص پر بھی جو ہمارے سامنے ہوتا ہے اپنی بھڑاس نکال لیتے ہیں لیکن نفرت کسی خاص شخص کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔

جب ایک بار یہ مشتعل ہو جاتی ہے تو ہماری کوششوں کے لیے تازیانہ ہوتی ہے۔ شخصی خصومت یعنی اپنے حریف کو صدمہ اور ضرر پہنچانے کا ولولہ کئی صورتوں سے ظاہر اور پورا ہو سکتا ہے۔ اس ولولے کی وجہ سے بعض لوگوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جو تاریخ میں یادگار ہیں اور جن سے نوع انسانی کو انمول فائدہ پہنچا ہے۔ اسی ولولے کی وجہ سے دنیا کے بدترین اور سنگین جرائم ظہور میں

آئے ہیں اور اسی کی وجہ سے ان لوگوں کی بدنامی کے چرچے اور عیب چینیاں کی جاتی ہیں اور اسی کی وجہ سے سرکاری خدمات میں، تجارتی کاروبار میں اور معاشرتی زندگی میں ان گنت شخصی خصومتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اسی جذبے کی وجہ سے بہترین شاعری اور بہترین ادب آج اپنی زبان میں ہم دیکھ رہے ہیں اور یہی جذبہ ہے جو اکثر و بیشتر ہمارے سیاسی، مذہبی اور دوسرے عام مباحث میں حصہ لیتا ہے۔ سائنٹفک مباحث میں بھی شخصی خصومت کا عنصر کسی طرح چھپا ہوا نہیں ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ شخصی خصومت اور مخالفت کے نتائج سوسائٹی کے لیے مضر ہوں۔ اکثر صورتوں میں مضر ہوتے ہیں لیکن بعض صورتوں میں مضر نہیں ہوتے۔ در اصل دیکھا جائے تو انسانی مساعی کے سرچشموں کے منجملہ یہ بھی ایک سرچشمہ اور ایک بڑی بنیادی خواہش ہے جو ہم سے کام لیتی ہے۔ اب ہمارے یہ کام مجموعی حیثیت سے سوسائٹی کے لیے مفید بھی ہو سکتے ہیں اور مُضر بھی۔

ایک آدمی سے مخالفت اکثر اس کی رائے کی بنا پر ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ ہم کو اہلِ امریکہ سے خاص طور پر نفرت ہے اور فرض کرو کہ ایک خالص امریکن آدمی کسی موضوع پر تقریر کر رہا ہے۔ ہماری اس آدمی سے نفرت غالباً ہمیں اس چیز سے اختلاف کرنے پر آمادہ کرے گی جس کی تائید میں وہ تقریر کر رہا ہے جس کی وجہ سے ہم اس کے دلائل کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ جس طرح ہم کسی شخص کے متعلق دوستانہ خیالات رکھتے ہیں تو وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو جلد تسلیم کر لیتے ہیں، اسی طرح کسی شخص سے مخالفت یا نفرت کی صورت میں ہر اُس شے پر اس کا اثر پڑتا ہے جو ہمارے خیال میں اس شخص سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تجربہ ہر شخص کو ہوا ہوگا۔

اب فرض کرو کہ ایک لڑکا ہے جس کا باپ طبیعت کا سخت اور ظالم ہے۔ بچہ

کھلم کھلا اپنے باپ کو کچھ نہیں کہتا لیکن باپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے وہ اپنے اندر دشمنی، سرکشی اور انتقام کے جذبات محسوس کرتا ہے۔ یہ قوی احتمال ہے کہ بڑا ہونے کے بعد وہ ہراُس چیز سے مخالفت رکھے جو اس کے باپ کو پسند تھی۔ اپنے باپ کے سخت مذہبی آدمی ہونے کی صورت میں بیٹا مذہب کا مخالف ہوگا۔ اگر باپ مذہب کے خلاف تھا تو بیٹا مذہبی آدمی نکلے گا۔ باپ قدامت پسند اور شاہ پرست طبقے سے تعلق رکھتا تھا تو بیٹا عمالی اور اشتراکی جماعت سے تعلق رکھے گا۔ اگر باپ عمالی جماعت سے تعلق رکھتا تھا تو بیٹا عمالی جماعت کا مخالف ہوگا۔

جس شخص سے ہم کو رشک یا عداوت ہو اُس شخص کی گفتگو کی تردید اور اس کی رائے کی تحقیر کرنے سے ہم کو کس قدر تسلی ہوتی ہے۔ غور کرو کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کی گفتگو محض دوسروں کی نکتہ چینی یا ان کی رائے پر تنقید سے متعلق ہوتی ہے۔ دراصل دیکھا جائے تو اس سے شخصی خصومت، رشک یا بغض کا اظہار ہوتا ہے۔

غلبہ اور حکومت کی خواہش

یہ خواہش بھی دراصل لڑائی کی جبلت سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر بنیادی خواہش کی طرح اس کے اظہار کے بھی سینکڑوں طریقے اس ابتدائی جبلت سے بالکل مختلف ہیں جو حریف کو چت کرنے اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ غلبہ اور حکومت کی خواہش کے زیرِ اثر ہم دنیا کو زیرِ نگیں کرنے کی کوشش کریں یا محض اپنی بیوی، بچوں اور اپنے ملازموں پر حکومت جتائیں۔ جب ہم ترقی کے لیے کوشش یا ایک رجمنٹ کی افسری کی خواہش کرتے ہیں یا

ترقی کر کے کسی کاروبار کے منتظم ہو جاتے ہیں یا تجارتی یا صنعتی دنیا کی بڑی ہستی بننا چاہتے ہیں تو یہی خواہش ہماری بڑی محرک ہوتی ہے۔ اسی خواہش کی وجہ سے اکثر لڑکے عمر کے ایک زمانے میں پولیس کے جوان یا انجن چلانے والے یا جہاز کے کپتان بننا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے ہم انجینیر بن کر اور زبردست انجنوں اور کل پرزوں کو اپنے تسلط میں کر کے اس خواہش کو پورا کریں یا ممکن ہے ایک زبردست ندی کو قابو میں کر کے اور اس کو رفاہِ عام کا ذریعہ بنا کر اپنے غلبے اور حکومت کی خواہش کو پورا کریں۔ ایک مدبر اقوام کی قسمت کو، ایک موٹر چلانے والا موٹر کے کل پرزوں کو، ایک ایڈیٹر رائے عامہ کو اور ایک اُستاد لڑکوں کو اپنے اپنے قابو میں کر کے اس خواہش کو پورا کرتے ہیں۔

تمام مقابلے کے کھیلوں میں یہی خواہش کام کرتی ہے اور جیتنے والی جماعت کی خوشی کا باعث یہی خواہش ہے۔ یہی خواہش غیر شعوری طور پر روزمرہ کے معمولی واقعات میں محرک ہوتی ہے۔ بہت سے موٹر چلانے والے (گو وہ ہزار انکار کریں) دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں جب کوئی پیدل آدمی تصادم کے خوف سے جلد راستہ کاٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک مرد خیال کرتا ہے کہ وہ گھر کا مالک ہے۔ اس کی بیوی خیال کرتی ہے کہ وہ گھر کی مالکہ ہے اور اس طرح دونوں حکومت اور غلبے کی خواہش کو پورا کرتے ہیں۔

برتری کی خواہش

ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اور کہیں نہ کہیں اپنی برتری کا اظہار کرے۔ اگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو عجیب و غریب طریقوں سے یہ خواہش پوری کی جاتی ہے۔ اے ایس نیل نے مدرسے کے ایک چھوٹے لڑکے کا واقعہ لکھا ہے۔ تعلیم

میں یہ لڑکا بہت سست تھا کھیلوں میں بھی وہ سب سے پیچھے تھا اور سب لڑکے اس کو حقیر نظروں سے دیکھتے تھے اور گھر میں بھی اس کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس طرح اس کی برتری کی خواہش کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی۔ لڑکے سے دریافت کرنے پر اُس نے اپنی قابلِ ستایش بات بتا ہی دی وہ یہ کہ مدرسے کے تمام لڑکوں میں اس کا تھوک بہت دور پہنچتا تھا۔

یہ خواہش کسی طرح پوری نہ ہونے کی صورت میں بعض عورتیں اپنی کمزوری یا علالت کے بہانے سے غیر شعوری طور پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اپنے آپ کو بیمار فرض کرکے وہ خاندان والوں سے اپنی خدمت لیتی، اپنی خواہشات کی تعمیل کراتی اور اس طرح اپنے خاندان والوں پر برتری حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ برتری کی نفسیات سے انھیں آگاہ کیا جائے (یا یہ کہ وہ یہ کتاب پڑھیں) اور پھر اس خواہش کی تکمیل کے لیے کسی دوسرے طریقے کی طرف بتدریج رہ نمائی کی جائے۔ یہ کافی نہیں ہے کہ انھیں قدیم طریقے سے خواہش پوری کرنے سے روک دیا جائے بلکہ اس خواہش کی تکمیل کا کوئی دوسرا طریقہ انھیں بتانا چاہیے۔

باپ، ماں اور چھوٹا بچہ سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ فلم بہت مذاق اور ظرافت سے مملو ہے اور ہر شخص اس کو بہت دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔ دفعتہً ایک ننھا لڑکا باریک آواز سے کہتا ہے "ابا۔ شراب پی کر مست اس طرح نہیں ہوتے۔ ہے نا ابا؟" باپ بہت خفیف ہوتا ہے لیکن ہم اس پر ہنستے کیوں ہیں؟ محض اپنی برتری جتانے کے لیے؟

ہم ایک نو دولتی عورت کو دیکھتے ہیں جو کپڑوں میں لدی ہوئی موسیقی کے سامان کی دوکان میں داخل ہوتی ہے۔ دوکان کا آدمی اسے منڈلسن کی کتاب

"گیت بغیر الفاظ کے" بتاتا اور اس کی قیمت کہتا ہے۔ اس پر عورت گرم ہو کر کہتی ہے "ہاں لیکن "گیت الفاظ کے ساتھ" کی کیا قیمت ہے؟"

یہ واضح رہے کہ اکثر و بیشتر صورتوں میں مذاق کسی کو متاثر کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص خفیف ہوتا ہے اور ہم غیر شعوری طور پر مقابلہ کر کے اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھتے ہیں۔ نوک جھوک کے لحاظ سے ظرافت کی بھی قسمیں ہیں۔ ایک ظرافت بے تکی قسم کی یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ٹوپی کے لیے جو ہوا سے اُڑ کر جا رہی ہے، دوڑتا ہے اور ہم اس کے دوڑنے پر مسکراتے ہیں۔ اگر وہ کچھ اونچی حیثیت کا آدمی ہے تو ہم اس منظر کو دیکھ کر زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر ہم اپنے آپ کو اس کے مقابل میں اس وقت برتر سمجھتے ہیں اور اس کے اس طرح خفیف ہونے سے خوش ہوتے ہیں۔

لیکن یہی خواہش دس ہزار طریقوں سے ظاہر ہو سکتی اور دس ہزار طریقوں سے پوری کی جا سکتی ہے۔ اکثر طریقے اس خواہش کے اظہار اور تکمیل کے عمدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً شکار اور دریافت کی خواہش کے ساتھ حکومت اور غلبے کی خواہش دماغی کام کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتی ہے جیسے کسی مشکل مسئلے کو حل کرنے کی کوشش۔ غالباً تم کو بھی یہ تجربہ ہوا ہوگا کہ سخت کوششوں کے بعد تم نے ایک مشکل مسئلہ حل کر لیا۔ اس وقت تمھاری خوشی سے یہ حالت تھی کہ تم اپنے آپ پر آفرین کر رہے تھے اور تمھارا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔

پھر بعض لوگ (خصوصاً وہ جو بہت سے امور میں دوسرے لوگوں سے کم اور ان کے زیر دست ہوتے ہیں) اپنی برتری کی خواہش کو مذہب کے ذریعے سے پورا کرتے ہیں۔ یہ مذہبی ذریعہ ان کو سکھاتا ہے کہ وہ ان منتخب لوگوں میں

ہیں جو سیدھے جنت میں جائیں گے اور قیامت کے دن ان کی برتری اور فتح مندی تمام دنیا پر آشکارا ہو جائے گی۔

اب بتاؤ کہ تم خود اس خواہش کو کس طرح سے اپنی زندگی میں ظاہر اور پورا کر رہے ہو یا اگر تم کسی شخص کے کردار یا طرزِ عمل کا مطالعہ کر رہے ہو تو یہ شخص کس طرح اس خواہش کو پورا کر رہا ہے۔

باتیں - باتیں - باتیں

لوگ کیوں بات کرتے ہیں؟ بعض اوقات اس لیے بات کرتے ہیں کہ سُننے والے اسے دلچسپی سے سنیں گے۔ بعض اوقات بات کچھ سنانے کے لیے کی جاتی ہے، بعض اوقات تبادلۂ خیالات کے لیے اور بعض اوقات دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ لیکن اکثر اوقات بات اس لیے کی جاتی ہے کہ سننے والے کی توجہ اپنی طرف رہے اور اس پر یہ واضح کیا جائے کہ ہم کیسے غیر معمولی، برتر اور قابلِ ستایش آدمی ہیں۔

اس طرح باتیں کرنے والا آدمی کوئی خاص بات نہیں کہتا لیکن اس کی باتوں کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ گفتگو بالکل اپنے ہی متعلق ہوتی ہے۔ غیر کا ذکر درمیان آتا ہے تو محض اس کو نیچا دکھانے کے لیے۔ ایسے باتونی شخص سے کس کو سابقہ نہیں پڑا اور کون شخص ایسا ہے جس کا کوئی نہ کوئی ملاقاتی اس طرح باتیں کر کے اپنی طرف توجہ منعطف کرانے کا عادی نہیں۔ ایسا شخص خاص طور پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ کس قدر غیر معمولی آدمی ہے۔ یہ شخص خواہ مخواہ اپنی ہی سرگزشت اور تجربات بیان کرے گا۔ مثلاً وہ ہم سے اپنی سیاحت کے متعلق تفصیل سے بیان کرے گا کہ کون کون سے مقامات کا اس نے

سفر کیا اور کیسے کیسے لوگوں سے اس نے ملاقات کی، کیا کیا چیزیں اس نے دیکھیں، کیا کیا کام اس نے کیے اور کیا کیا واقعات اسے پیش آئے۔ کون ایسا ہے جو ایسے شخص سے نہ ملا ہو جو اپنے تمام واقعات، اپنے جذبات اور اپنے خیالات کا تذکرہ خواہ مخواہ کرنے کا عادی نہیں اور "میں نے ایسا کہا اور اس نے ایسا کہا اور میں نے یہ جواب دیا اور اُس نے یہ جواب دیا اور پھر میں نے صاف صاف ایسا کہا" کہتے نہ سُنا ہو۔

ممکن ہے کہ یہ گفتگو علانیہ شیخی کی نہ ہو اور بالکل ممکن ہے کہ گفتگو کرنے والے سے اگر یہ کہا جائے کہ دراصل وہ اپنی بڑائی ہانک رہا ہے تو وہ اس کا بہت اثر لے لیکن بعض اوقات یہ گفتگو کھلم کھلا تعلی کی ہوتی ہے مثلاً یہ کہنا تعلی نہیں تو اور کیا ہے کہ "دو ڈاکٹروں نے آپ کے متعلق صاف جواب دے دیا تھا؟ مجھے خوب یاد ہے کہ تین ڈاکٹروں نے میرے بارے میں بھی ایسا ہی کہا تھا۔"

اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ چند مرد یا عورتیں ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک مرد یا ایک عورت نے میدان مار لیا ہے اور بغیر رُکے بولتا جا رہا یا بولتی جا رہی ہے اور یہ گفتگو یقیناً آپ بیتی ہے۔ گفتگو کہیں ختم نہیں ہوتی اور اگر کہیں بیچ میں کوئی دوسرا شخص کوئی اور گفتگو چھیڑ دیتا ہے یا کوئی اس سلسلے کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر ردوقدح سے سلسلہ ملا لیا جاتا ہے۔ غریب سامعین میں سے کبھی ایک شخص کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر (تاکہ سب ہمہ تن محو رہیں) باتیں کی جاتی ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی وقفہ نہیں دیا جاتا تاکہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر کوئی دوسرا تذکرہ نہ چھیڑ دے۔

یہ واضح رہے کہ ہمارے آداب میں بعض باتیں ممنوع قرار دی گئی ہیں بعض سوسائٹیوں میں اس چیز کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ کوئی شخص زیادہ بول کر دوسرے کے بولنے کا وقت تو نہیں لے رہا ہے۔ گفتگو کے لیے بہترین اصول یہ ہے کہ آدھا آدھا

وقت بانٹ لیا جائے۔ آدھا وقت میں تمھاری گفتگو سنتا رہوں اور تم کو حیرت کی نظر سے دیکھوں اور آدھا وقت تم میری گفتگو سنو اور مجھے حیرت کی نظر سے دیکھو۔

اپنی کم زوری کا احساس

کسی خاص چیز میں اپنی کم زوری کے احساس کی بنا پر ایک شخص کسی دوسری چیز میں اپنی بڑائی جتا کر اس کمی کی تلافی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تعلّی عموماً کم زوری ہی کے احساس کا نتیجہ ہے۔ تعلّی کے پردے میں کسی خاص کم زوری کا احساس ہوتا ہے جس کو تعلّی کرنے والا خود اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہم سب نادانستہ طور پر اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ جن باتوں میں ہم دوسروں سے کم زور واقع ہوئے ہیں ان پر لوگوں کو متوجہ ہونے کا موقع نہ دیں اور ان باتوں پر زیادہ زور دیں جن میں ہم سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں سے بڑھے ہوئے ہیں کسی نہ کسی چیز میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم بڑھے ہوئے ہیں اور اپنے اس احساس کے تحت ہم نادانستہ طور پر دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ صرف اسی چیز کو اہمیت حاصل ہے اور دوسری چیزیں اہم نہیں ہیں۔ اگر ہم جسمانی لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں تو ہم خود بھی یہ یقین کر لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جسمانی قابلیت اور جسمانی قوت ہی انسان کے لیے امتحانی چیز ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہم جسمانی لحاظ سے کم زور ہیں لیکن دماغی لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں تو جسمانی قوت ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دماغی قابلیت ہی بہت اہم چیز ہے۔ اگر ہم اچھے مزدور اور اچھے کسان نہیں ہیں تو سیاسیات پر ہی جائے خانے

میں اپنا سکّہ جماتے ہیں ۔ اگر ہم تعلیم یافتہ نہیں ہیں لیکن بغیر تعلیم کے دولت مند ہو گئے ہیں تو پھر تعلیم کی ہمارے پاس کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ تہذیب میں تعلیم بہت بڑھ گئی ہے اور یہ آدمی کو نکما کر دیتی ہے ۔ برخلاف اس کے اگر ہم تعلیم یافتہ ہیں لیکن کاروباری دنیا میں ہمیں کامیابی نہیں ہوئی ہے تو کاروباری کامیابی کو ہم ہیچ در پوچ ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے ۔ عام طور پر اگر ہر چیز میں کامیابی ہمارے ساتھ رہی ہو تو ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ کامیابی محنت ، قابلیت اور عمدہ کردار کا نتیجہ ہے لیکن اگر ہم ناکام رہے ہیں تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ کامیابی قسمت کی بات ہے ۔ کیا ہم ایسا نہیں سمجھتے ؟

انگور کھٹّے ہیں

تمھیں ایسپ کی کہانی لومڑی کے متعلق یاد ہو گی جس نے یہ معلوم کر کے کہ انگور کے خوشے تک اس کی رسائی ممکن نہیں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ انگور غالباً کھٹے ہیں ۔ یہی حالت ہم اکثر اپنے ہم جنسوں میں پاتے ہیں ۔ اگر سچائی کے ساتھ ہم اپنا جائزہ لیں تو یہی بات ہم اپنے آپ میں بھی پائیں گے ۔

بُزدل لوگ اکثر جری دل لوگوں کی تحقیر کرتے اور ان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں ۔ یہ محض اس لیے کہ انگور کھٹے ہیں کم زور لوگ جسمانی قوت کی بُرائیاں بیان کرتے ہیں ۔ بدمعاش لوگ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان دار لوگ بُزدل ہوتے ہیں یا بے وقوف ۔ جو لوگ غیر شعوری طور پر ناچ کی محفل میں ناچنا تو چاہتے ہیں مگر ناچ نہیں سکتے، ناچنے کو کبھی اچھا نہیں کہتے ۔ برخلاف اس کے جو لوگ ناچنا تو جانتے ہیں مگر ناچتے نہیں وہ کبھی دوسرے لوگوں کے ناچنے پر معترض نہیں ہوتے ۔ جو شخص ہتھیاروں کو برابر استعمال نہیں کر سکتا وہ اگر چاہے تو انھیں اچھی طرح استعمال کر سکتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ انگور کھٹے ہیں ۔ کاہل آدمی اگر اپنے ساتھی کی مانند

محنت سے کام نہیں کرتا تو اس کی وجہ اس کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کے لیے پسینہ بہا کر احمق بننا نہیں چاہتا اور اپنے اس خیال کی تائید میں وہ ایسے معاشی یا معاشری نظریے کو فوراً قبول کرلیتا ہے جو اس کی کاہلی کو حق بجانب قرار دے۔ جن لوگوں کی آنکھیں سینما دیکھنے سے دُکھتی ہیں وہ سینما دیکھنے کو تضیعِ اوقات یا اس سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔

ایسپ کی ایک اور کہانی یہ ہے کہ ایک گیدڑ کی دُم پنجرے میں پھنس کر کٹ گئی تھی۔ اس پر گیدڑ نے تمام گیدڑوں کی دعوت کی اور ایک پُر اثر تقریر کی جس میں دُم کا ایک بے کار اور بھونڈی چیز ہونا واضح کر کے یہ اصرار کیا تھا کہ وہ سب اس کی تقلید کریں اور اپنی دُم کٹوا ڈالیں۔ ہم کو بھی اپنے ارد گرد نظر ڈالنے پر معلوم ہوگا کہ جو آدمی عام لوگوں کی واجبی تفریحوں پر بہت سختی سے نکتہ چینی کرتے اور ان کو مسدود کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ان تفریحوں میں خود حصہ لینے کے قابل نہیں ہوتے۔

ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر شخص کسی دوسرے کی نظر میں اپنا وقار قائم کرنا چاہتا ہے۔

ہر شخص کسی نہ کسی طریقے سے چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو برتری حاصل رہے۔ اگر ایک طریقے سے برتری کے حصول میں ناکامی ہوتی ہے تو دوسرے طریقے سے اس کو حاصل کرتا ہے۔ اس بارے میں تمھارا عمل کیا ہے؟

ہر شخص یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ دوسرے کسی نہ کسی چیز میں اس سے کم ہیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو خوش کرلیتا ہے۔

جنسیت

جنسیت انسانی زندگی کے لیے ایک زبردست قوت ہے اور اکثر و بیشتر انسانی جدوجہد اسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر احساسات اور طرزِ عمل کی لم یہی ہے اور عموماً فطرتِ انسانی بہت بڑی حد تک اور خصوصاً شخصی کردار جنسی خواہشات اور جبلت کے رہینِ منت ہیں۔

ہر صحیح مرد اور عورت میں جنسی خواہش موجود رہتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ خواہش سب میں ایک ہی معیار پر رہے کیونکہ یہ خواہش ادھیڑ عمر یا بڑھاپے میں رفتہ رفتہ گھٹ جاتی ہے۔ لیکن جوان ہونے کے کم از کم تیس سال بعد تک ہر تندرست مرد اور عورت میں یہ خواہش جوان رہتی ہے۔ جن صورتوں میں اس جنسی جبلت کو راست طور پر اظہار کا موقع نہیں ملتا ان میں بھی اس کی تڑپ پائی جاتی ہے جو غیر شعوری طور پر مختلف قسم کے احساسات اور جدوجہد کی علت ہوتی ہے گو یہ احساسات اور جدوجہد اصل روپ میں ظاہر نہ ہوں اور گو شخصِ متعلق اصل لم سے بالکل ناواقف ہو۔

جنسی جبلت کے عامیانہ اظہار کے ذریعے فحش قصے، فحش مذاق، فحش تصاویر اور فحش قسم کا علم و ادب ہیں۔ جب کوئی شخص فحش قصوں وغیرہ میں خاص طور پر دلچسپی لیتا ہے تو یہ سمجھ جاؤ کہ ایسے شخص کی جنسی زندگی اطمینان بخش طریقے سے یا صحت کی حالت کے ساتھ نہیں گزر رہی ہے۔ اس کی وجہ خارجی حالات ہو سکتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں اس کی وجہ یا تو کوئی جسمانی نقص ہے یا دماغی خلفشار۔ جنسیت میں بڑھی ہوئی دلچسپی جو بعض اوقات خبط کی صورت اختیار کر لیتی ہے، ہمیشہ جنسی کمزوری یا دبی ہوئی خواہشات کو ظاہر کرتی ہے۔

جنسی خواہش صحیح طریقے سے ظاہر ہونے کی بجائے دوسرے مختلف طریقوں

سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ حد سے زیادہ شرمانا، نامہذب خبروں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرنا، کسی قسم کی نمایشی ہیئت دیکھ کر پیچ و تاب کھانا، دوسروں کے معاملاتِ محبت میں سختی (جو نادانستہ طور پر رشک کا نتیجہ ہے) یا مذہب کی بعض جاہلانہ اور جذباتی قسمیں، یہ سب باتیں کم و بیش جنسی جذبات کی بگڑی ہوئی شکل کو ظاہر کرتی ہیں۔
بعض مذہبی فرقوں میں جو پیرایۂ زبان اختیار کیا جاتا اور جو گیت گائے جاتے ہیں وہ اس قدر عاشقانہ ہوتے ہیں اور ان پر جو پردہ ڈالا جاتا ہے وہ اس قدر باریک ہوتا ہے کہ صرف پرلے درجے کا بے وقوف ہی ان کی خصوصیت کو شاید نہ سمجھ سکے۔
یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ جنسی جذبات کا اظہار صرف انھیں عامیانہ طریقوں کی حد تک ہے۔ جو لوگ زیادہ مہذب اور جن کا مذاق زیادہ بلند ہوتا ہے ان کی جنسی خواہش اکثر اس قدر رفیع ہوتی ہے کہ اس کو تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ علمائے نفسیات کہتے ہیں کہ ہماری اعلیٰ ترین موسیقی اور شاعری زیادہ تر جنسی عنصر کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ اس طرح یہ جنسی تڑپ ہماری گوناگوں کوششوں میں نظر آتی ہے گو ان کوششوں کو جنسیت سے براہِ راست تعلق نہ ہو۔ یہاں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جنسیت انسانی قوت کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ اگر محبت اور ازدواج کے صحیح طریقے سے اس خواہش کی تکمیل نہیں کی گئی تو پھر کسی دوسرے طریقے سے اس کی تکمیل ضروری ہے۔ سخت جسمانی محنت یا کسی دماغی کام میں اس قوت کو صرف کیا جا سکتا ہے لیکن عموماً اظہارِ جذبات کے لیے اس کو واسطۂ کار بنایا گیا ہے۔ زندگی کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ جنسی خواہش راست طور پر ظاہر نہ ہونے کی صورت میں اس کو کیوں کر مرتفع کیا جائے تاکہ سوسائٹی کے خلاف یا محض رائگاں ہونے کے مفید نتیجے اس سے مترتب ہو سکیں۔
لیکن یہ واضح رہے کہ جنسی خواہش کے اظہار کا بہترین ذریعہ

محبت، تعشُّق اور ازدواج ہی۔ جن صورتوں میں یہ ناممکن ہو یا ایسے زمانے میں (جیسے بلوغ سے قبل) جب کہ یہ خواہش نامناسب ہو ہم اس کے مناسب بدل کے متعلق غور کرسکتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ غیر شائستہ محض جسمانی یا ناجائز قسم کے جنسی تعلقات بھی روا ہیں۔ یہ صحیح ہی کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی محبت محض حیوانی جبلّت سے بڑھ کر نہیں ہوتی جس کی وجہ یہ ہی کہ یہ لوگ خود زیادہ تر حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں لیکن جیساکہ پروفیسر جے۔ اے تھامسن لکھتے ہیں "انسانی محبّت ارتقا کے دوران میں بہت پیچیدہ ہوگئی ہی۔ جنسی کشش سیدھے سادے طریقے سے گزر کر اور پیچیدہ صورت اختیار کرکے جذبے کو اور مشتعل کرتی ہی۔ محبت کا یہ رنگ جب نکھرتا ہی تو فطری اور دل فریب ہوتا ہی۔ .... اِس کی مثال ایسے درخت کی ہی جس کی جڑیں بہیمی فطرت میں بہت دُور تک چلی گئی ہیں لیکن اس کی شاخیں بہت بلند ہیں جنھیں دھوپ پہنچتی ہی اور جو بارآور ہوتی ہیں۔"

جن مردوں یا عورتوں کو جنسی تجربہ محض بہیمیت کی حد تک ہوا ہی ممکن ہی وہ اس تعلق کو نفرت کی نظر سے دیکھیں اور یہ موضوع انھیں بہت ناگوارِ خاطر ہو۔ یہ احساس ماں سے بیٹوں کو پہنچ سکتا ہی اور ممکن ہی بیٹیاں بھی جنس کے بارے میں تنفر رکھیں اور جنسی تعلق کو کم و بیش ایک بہیمی تعلق سمجھیں۔ مگر ان صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہی اس کو پڑھنے کے بعد ان کے اس خیال کی اصلاح ہوسکتی ہی۔

تعشُّق کی خواہش

جنسی فطرت کی دو شاخیں ہیں ایک تعشق اور دوسرے ازدواج۔ گو یہ دونوں ایک ہی فطری طرزِ عمل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ابتدائی فطرت سے قطع نظر کرکے تعشق کی تہ میں جن خواہشات اور طرزِ عمل کا ظہور ہوتا ہی وہ اکثر و بیشتر صورتوں میں ازدواجی

خیال سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہر صحیح مرد اور عورت میں جن کا ازدواج نہیں ہوا ہے یہ جذبہ ایک حد تک موجود ہوتا ہے (گو یہ جذبہ انفرادی طور پر بڑھا ہوا یا گھٹا ہوا ہے) کہ اپنی مخالف جنس کو اپنی طرف متوجہ اور مایل کرنے کی کوشش کرے۔ اب اس جذبے کا اظہار معمولی معمولی باتوں سے ہو سکتا ہے جیسے ٹائی کو برابر کرنا، مسکراتے ہوئے دیکھنا، پیرایہ کی تبدیلی یا زیادہ بانکپن اور چستی کے انداز میں جسم کی حرکت۔ اگر یہ جذبہ زیادہ قوی ہے تو آزمایشی پیش قدمیاں شروع ہو جاتی ہیں جن کی حوصلہ افزائی ہوئی تو راز و نیاز کی باری آتی ہے لیکن جب یہ خواہش اور جذبہ کسی ایک شخص کے ساتھ بالکل وابستہ ہو جائے تو پھر تعشق کی ابتدا ہوتی ہے جس کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کو اپنی طرف متوجہ اور اس کے دل میں بھی وہی جذبہ پیدا کیا جائے۔

تعشق کی خواہش بھی تقریباً دوسری بنیادی خواہشات کی طرح بالکل ابتدائی فطری طریقوں کے علاوہ دوسرے مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ مثلاً دوسری خواہشات کے ساتھ مل کر یہ خواہش لباس کی طرف زیادہ خیال کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کر سکتی ہے۔ خصوصاً عورتیں جو نیم عریاں لباس پہنتی ہیں اس کی ایک وجہ یہی خواہش ہے گو جھلے پن سے اس سے وہ کتنا ہی انکار کریں۔ یہی خواہش موسیقی، شاعری اور ادب کے ذریعے سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور اسی کی وجہ سے اکثر لوگ عشق و عاشقی کے قصے اور ناٹک پسند کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہی وہ عنصر ہے جو جنس کے رومانوی رُخ کو ظاہر کرتا ہے۔

محبّت و ازدواج

جب تک محبّت کے مراحل پورے طے نہ ہوں اور جب تک فریقِ ثانی میں بھی وہی جذبہ اور وہی اشتیاق پیدا نہ ہو ازدواجی جبلت سے کام

نہ لینا چاہیے۔ محض رضامندی کافی نہیں ہے۔ موثر معاشقہ سے قبل ازدواج خلافِ فطرت ہے اور جسمانی اعتبار سے بھی ایسے ازدواج کا غیر اطمینان بخش اور تنفر انگیز ہونا لازم ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ صرف شادی ہی کے قبل تعشق ضروری نہیں ہے بلکہ شادی کے بعد ہر ازدواجی فعل کی ابتدا موثر و مناسب محبت سے ہونی چاہیے۔

یاد رہے کہ گو محبّت ہر دو جنس میں مختلف پیرائے اختیار کرتی ہے لیکن مرد اور عورت دونوں کے لیے خصوصیت سے فطری اور ضروری ہے۔ مکمّل ازدواج کے لیے تعشق دونوں طرف سے ہونا چاہیے۔ محض مرد ہی کی جانب سے اظہارِ تعشق اور عورت کی جانب سے محض اظہار رضامندی فطری نہیں ہے۔

"جنسیت" محبّت کا نام نہیں ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان محبت کا تعلق ایک بہت پیچیدہ چیز ہے۔ جنسی خواہشات اور ان کی تکمیل اس تعلّق کا ایک جزو ہیں۔ جہاں تعلقِ محبت مکمل ہوتا ہے وہاں تمام بنیادی اغراض اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں اور بنیادی خواہشات کی ایک حد تک تکمیل بھی وہیں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسی محبّت کی وجہ سے جانبین کے باہمی خیالات اور احساسات ہمدردانہ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات دونوں میں ہوں لیکن یہ ضروری ہے کہ دو دماغ اور دو طبائع ہم رنگ رہیں۔ مگر بدقسمتی سے ایسا مکمل تعلق بہت شاذ پایا جاتا ہے۔

گو منجملہ اور بہت سے امور کے جنسیت بھی مکمّل تعلّقاتِ محبّت کا ایک جزو ہے لیکن یہ ایک ایسا جزو ہے جس کی اہمیّت کو ہم کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں جہاں جنس نہیں وہاں دنیا ہیچ ہے۔ ایک جذباتی آدمی یا جنسی اشتراکیت کے طرف دار کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دراصل

یہی ایک چیز جانبین کو آپس میں متحد کرتی ہے کہ ان دونوں میں ایک مرد ہے اور ایک عورت ۔

جنسیت کے لحاظ سے ناموزوں جوڑے میں ازدواج یقیناً زندگی کے لیے اندوہناک ہوتا ہے گو دوسری باتوں میں میاں بیوی کیسے ہی متحد کیوں نہ ہوں ۔ ان لوگوں نے جنھوں نے اس مسئلہ میں تحقیقات کی ہے اور جنھیں کافی اور وافر ثبوت بہم پہنچا ہے اسی ایک امر پر زور دیا ہے کہ اکثر شادیاں محض اس وجہ سے کالعدم ہوتی ہیں کہ جانبین جنسیت کے لحاظ سے آپس میں موزوں نہ تھے ۔ بعض حالات میں جسمانی خرابی علیحدگی کی وجہ ہوتی ہے جو علاج معالجہ سے دور کی جا سکتی ہے ۔ بعض حالات میں مرد کی ناواقفیت اور جنس کے متعلق غلط خیالات علیحدگی کی وجہ ہوتے ہیں لیکن اکثر حالات میں اس کی وجہ عورت کا جنسیت کے مسئلہ میں وہ غلط اور غیر فطری طرزِ عمل ہے جو اس خیال کے باعث ہوتا ہے کہ مواصلت شرمناک چیز ہے ۔ اگر اس طرزِ عمل کی اصلاح نہیں ہوئی تو بیاہی زندگی کبھی خوشی کے ساتھ نہیں گزر سکتی ۔

جنسی تعلیم کے جس قدر طریقے بھی رائج ہیں وہ سب غلط ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بہت خرابی کی بات ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے دماغ میں جنسی تصور محض جسمانی حیثیت سے ذہن نشین کرایا جائے ۔ سچ تو یہ ہے کہ جنسی تعلقات اگر ایک طرف بلند و برتر چیز ہیں تو دوسری طرف ان سے بڑھ کر کوئی چیز گھناؤنی نہیں ہو سکتی ۔ اب اس کو سمجھنا جانبین کے طرزِ عمل، تعلیم اور اس خیال پر منحصر ہے جس کے تحت وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں ۔ سب سے بڑھ کر ان تعلقات کا دارومدار اس امر پر ہے کہ آیا مرد یا عورت صرف اپنے حظِ نفس کے لیے کوشاں ہے یا یہ کہ دوسرے کی کامل خوشی اور حظِ نفس کا بھی اس کو خیال ہے ۔ اپنے حظِ نفس کے خیال کے ساتھ تعلق کی صورت بہت ہی ذلیل اور پرلے درجے کی بہیمیت ہے لیکن دوسرے

کی خوشی اور حفظِ نفس کا خیال ایک اعلیٰ اور نہایت ہی مسرت آگیں تجربہ ہے جس سے انسانی زندگی ترقی کے بہت کچھ منازل طے کر جاتی ہے۔

شفقت اور نگہبانی

تمام صحیح انسانوں میں کسی ایسی ذات کی پرداخت اور اس کی نگہبانی اور حفاظت کی خواہش پائی جاتی ہے جو نسبتاً کم زور اور بے بس ہے۔ عورت میں یہ خواہش اس کی ماتا کی جبلت سے تعلق رکھتی ہے جس کا کام اپنے بچوں کی پرورش اور ان کی حفاظت ہے۔ مرد میں یہ جبلت اپنے جوڑے کی آسایش کی فکر اور اس کی حفاظت سے متعلق ہے۔ اسی جبلت کی وجہ سے عورت اپنے جوڑے اور بچوں سے شفقت اور محبت رکھتی اور نگہبانی کرتی ہے۔ اسی طرح مرد عموماً نہ صرف اپنے بچوں سے بلکہ اپنے جوڑے سے بھی محبت رکھتا اور ان کی نگہبانی کرتا ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان حقیقی محبت کے لیے یہ ایک ضروری چیز ہے جن مردوں میں یہ جبلت بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ اس قسم کی عورتوں سے تعلق پیدا کرتے ہیں جن کی طبیعت کسی کی پناہ میں رہنے کو پسند کرتی ہے تاکہ وہ اپنی شفقت اور نگہبانی کی خواہش کو پورا کر سکیں۔ اسی طرح بعض عورتوں میں مرد کے ساتھ مادرانہ نگہبانی کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ الا ماشاء اللہ نہایت ہی بازاری قسم کے تعلقات کے سوا تقریباً تمام جنسی تعلقات میں شفقت و نگہبانی کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔

ہر بنیادی خواہش کی طرح کسی ذات کے ساتھ شفقت و نگہبانی کی خواہش کسی نہ کسی طریقے سے پوری ہونی ضروری ہے۔ ایک چھوٹی لڑکی اپنی گڑیا کے ساتھ، ایک چھوٹا لڑکا اپنے پالتو جانور کے ساتھ، ایک نوجوان لڑکا اپنی موٹر سائکل کے

ساتھ ، ایک نوجوان لڑکی اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ ، ایک محبت کرنے والا شوہر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ، ایک محبت کرنے والی بیوی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ ، ایک غیر شادی شدہ عورت اپنی بلی یا کتے کے ساتھ ، ایک بہادر آدمی تمام عورتوں اور بچوں کے ساتھ اپنی اس خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ دنیا کی معاشری اور رفاہی تحریکات کی روح رواں یہی خواہش ہوتی ہے جس کی بنا پر غریب، بدقسمت اور ستم رسیدہ لوگوں کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جب تک یہ خواہش کسی نہ کسی طریقے سے ظاہر ہو کر پوری نہ ہو، کوئی زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اب بتاؤ کہ تمھاری زندگی میں یہ خواہش کس طریقے سے ظاہر اور پوری ہو رہی ہے۔

تنہائی، سنگت اور ہمدردی کی خواہش

کیا تم چار آدمیوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتے ہو؟ اور کیا یہ خواہش تم میں زیادہ ہے؟ اور اگر تم کسی دوسرے شخص کا خیال کر رہے ہو تو کیا یہ کہہ سکتے ہو کہ اس شخص میں یہ خواہش بہت ترقی پذیر حالت میں ہے؟

یہ بھی ایک جبلت ہے اور ہر صحیح و تندرست آدمی میں اس جبلت کا ہونا ضروری ہے۔ بلیوں اور شیروں میں یہ جبلت نہیں ہوتی کہ یہ خلوت پسند درندہ جانور ہیں۔ کتوں، بھیڑیوں اور ہاتھیوں میں یہ جبلت ہوتی ہے کہ یہ اپنے جتھے کے ساتھ رہتے ہیں۔ آدمی بھی ایک حد تک جماعت پسند ہے۔ لیکن مختلف افراد میں یہ خواہش مختلف معیار پر رہتی ہے جس کی بڑی وجہ بچپن کے زمانے کے مختلف اثرات ہیں۔

جس شخص میں یہ خواہش بڑھی ہوئی رہتی ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے تجربات میں کوئی دوسرا بھی شریک رہے خصوصاً یہ ایسا آدمی ہو جو ان تجربات میں اسی طرح

عمل کرنے والا ہو جس طرح وہ خود کرتا ہے۔ میکڈوگل کہتا ہے "جس شخص میں یہ جبلت بڑھی ہوئی ہوتی ہے وہ تنہا کسی چیز میں بھی کامل مسرت حاصل نہیں کر سکتا بلکہ کسی ہمدرد دوست کی شرکت میں وہی چیز اس کے لیے بہت بڑی مسرت کا باعث ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ وہ قدرت کے دل فریب مناظر کا شایق ہے لیکن اگر وہ چہل قدمی کے لیے تنہا نکل جاتا اور بہت ہی دل فریب مناظر دیکھتا ہے تو اپنی جماعت پسند طبیعت کی وجہ سے وہ ان مناظر کا لطف نہ اُٹھا سکے گا۔" اس طریقے سے ہم یہ اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ آیا کسی شخص میں اس جبلت کی کمی ہے یا بیشی؟ بعض اوقات محض کسی شخص کی موجودگی ہی ہمارے لیے ایک گونہ تسلّی کا باعث ہوتی ہے گو یہ شخص ہمارے لیے بالکل اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ جب ہماری زندگی طویل اور صبر آزما تنہائی میں گزرتی ہے تو اس وقت ہم کسی انسان کی صحبت کو ایسی تنہائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیدِ تنہائی ایک سخت ترین سزا ہے۔

معمولی طور پر محض کسی ایک آدمی کی سنگت ہماری تسلّی کا موجب نہیں ہوتی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری صحبت میں ہماری ہی قسم کا کوئی آدمی ہو جو ہمارا ہی ہم خیال اور ہم مذاق ہو اور ایسا شخص ہو جس سے ہم کو ہمدردی ہو سکتی ہو۔ یہ خواہش پوری نہ ہو تو ہم اپنی تنہائی کو محسوس کرتے ہیں اور گو مجمع میں بھی ہم رہیں تب بھی یہ تنہائی ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

بہت سی معاشری اصلاحات کے لیے کوششیں اسی خواہش کی بنا پر ہوتی ہیں اور دوستانہ تعلّقات کے قیام میں اسی خواہش کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے اور ایک مرد اور عورت میں کامل محبّت اسی کی بدولت ہوتی ہے۔

جتھا

اکثر علمائے نفسیات نے دوستی کی خواہش اور گروہ میں رہنے کی جبلّت

اور تقلید کو جتھے کی جبلت کے تحت رکھا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جتھے یا ٹولی کے قیام کے لیے ایک آدمی اپنی ہی قسم کے آدمیوں میں شریک ہو کر جتھے کی بڑی علتِ غائی کو پورا کرتا ہے۔ سوسائٹی کا لفظ وسیع مفہوم نہیں رکھتا اور اس لیے جتھے کا لفظ بہ نسبت سوسائٹی کے لفظ کے زیادہ موزوں ہے۔

نفسیات کے اعتبار سے ہمارا جتھا لوگوں کی کسی جماعت یا مجلس یا فرقے پر مشتمل ہو سکتا ہے جس سے ہم اپنے آپ کو وابستہ سمجھیں۔ اب یہ جماعت وغیرہ مجموعی اعتبار سے قوم یا کوئی سیاسی جماعت یا کوئی کلیسا یا کوئی رجمنٹ یا کوئی مدرسہ یا کوئی معاشری حلقہ یا کوئی خاندان یا اور کوئی جماعت ہو سکتی ہے جس کے افراد ہماری ہی قسم کے ہیں۔

اس کتاب کے آیندہ حصے میں ہم اپنے جتھے کے ساتھ ساتھ رہنے کے جذبے کی اہمیت کے متعلق بحث کریں گے۔

یہ بہت ضروری ہے کہ جتھے کے معنی پہلے سمجھ لیے جائیں۔ کوئی آدمی ایک قوم، ایک گرجا، ایک سیاسی جماعت یا ایک معاشری حلقے کا ممبر ہونے کے باوجود اس کو نفسیاتی اعتبار سے اپنا جتھا نہیں قرار دے سکتا۔ دراصل جتھے کا تعلق احساس سے ہے۔ مندرجۂ بالا جماعتوں میں سے کوئی ایک جماعت بھی نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا جتھا ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ محسوس کرے کہ وہ اس کا ایک فرد ہے۔ اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ واقعی وہ اس جماعت کا فرد اور اسی سے وابستہ ہے اور اس جماعت کی کامیابی اس کی کامیابی اور اس جماعت کی ذلت اور نقصان اس کی ذلت اور اس کا نقصان ہے تو پھر وہ جماعت اس کا جتھا کہلائی جا سکتی ہے۔

ہر صحیح مرد اور عورت کا کوئی جتھا ہونا ضروری ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے ایک شخص کے ایک سے زاید جتھے ہو سکتے ہیں۔ اگر تم اس کتاب کے پڑھتے وقت کسی خاص شخص

کا مطالعہ کر رہے ہو تو اب غور کرو کہ اس کا تعلق کتنے جتھوں سے ہے۔ یہ بہت ضروری چیز ہے کیونکہ تقلیدی جبلّت جس کا بیان آگے آتا ہے، جب جتھے میں رہنے کی جبلت کے ساتھ مل جاتی ہے تو اس کی قوّت بہت بڑھ جاتی ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ کسی شخص کو کسی خاص جتھے سے علیحدہ کریں تو یہ ایسی صورت میں کر سکتے ہیں جب کہ اس کو کسی دوسرے جتھے سے وابستہ کر دیں۔ بغیر جتھے کے زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کی ایک اہم ترین ضرورت کی تکمیل نہیں ہوئی ہے۔ ایسی زندگی ناخوشی میں گزرتی ہے۔ ایک لڑکے کو اس کے ساتھ کے لڑکوں سے یا ایک شخص کو اس کی جماعت، اس کے گرجا یا اس کے دوستوں سے اسی صورت میں علیحدہ کیا جا سکتا ہے جب کہ کسی دوسرے جتھے سے اس کا تعلق قائم کر دیا جائے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کسی جتھے سے تعلق قائم کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس کا ایک فرد بنا دیا جائے بلکہ اس کو یہ محسوس کرانے کی ضرورت ہے کہ فی الحقیقت وہ نئے جتھے کا ایک ایسا جزو لاینفک ہے جیسا وہ پُرانے جتھے کا تھا۔

تقلید

کہتے ہیں کہ انسان ایک تقلید پسند جانور ہے۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ تقلید فطرتِ انسانی کی ایک بڑی بنیادی طاقت ہے۔ اگر ہم اپنے خیالات اور احساسات، اپنی وضع قطع اور اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لیں گے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم اپنے آپ سے منسوب کرتے ہیں وہ در اصل ہم نے دوسروں سے حاصل کیا ہے۔

تقلید کرنے والے بچّے

بچپن کے زمانے میں دوسروں کی تقلید کرنے کا جو رُجحان ہوتا ہے اس کی زبردست

اہمیت کو ہمیں ہرگز نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ یقیناً بچپن کے بعد بھی ہم بہت کچھ تقلید سے سیکھتے ہیں لیکن جوانی میں ہماری عادتیں مستحکم ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے تقلیدی جذبہ ان عادتوں سے متصادم ہوتا ہے اور اس کی روک تھام ہوتی رہتی ہے۔ بڑھتے بچے میں عادتیں مستحکم نہیں ہوتیں۔ اس کا خمیر نرم اور اثر پذیر ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ تقلیدی اثرات بچے میں بہت نمایاں ہوتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچہ (حتیٰ کہ شیرخوار بچہ بھی) مسکرا کر دیکھنے والے کو دیکھ کر خود بھی مسکراتا ہے، دوسرے بچے روتے یا ہنستے ہیں تو خود بھی ان کی ہمدردی سے روتا یا ہنستا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ دوسروں کی آواز کی تقلید کرتا اور باتیں سیکھتا ہے اور تم جو اس کو مخاطب کر کے کہتے ہو کہ یہ گھوڑا ہے اور وہ گائے ہے تو وہ بھی تمھاری آواز کی تقلید میں گھوڑا اور گائے کہنے لگتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ جب اس کے دماغ میں یہ باتیں جم جاتی ہیں تو وہ جانوروں کو ان کے نام سے بولتا ہے۔ اس طرح یہ عادت اس میں تقلید سے ہوتی ہے۔

سمجھ دار ماں باپ اپنے یا اپنے بچوں کی بہت سی عادتوں کی ابتدا اسی طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً پریشانی کی حالت میں نیچے کا ہونٹ چبانا ممکن ہے بچے نے اپنے باپ سے سیکھا ہو۔ ماں مینڈک سے ڈرتی ہے تو ممکن ہے بچہ بھی ماں کی تقلید میں مینڈک سے ڈرے اور اس کے دل میں کیڑوں سے ہیبت اپنے کسی ننھے ساتھی کی تقلید میں ہوئی ہو۔ میز پر بیٹھے ہوئے چمچے سے کھیلنے کی عادت اس میں گھر کے کسی مہمان کو دیکھ کر ہوئی ہو جو چائے کی دعوت میں اپنے خاندان کے ساتھ آیا تھا۔ بات کرنے کا طریقہ، کسی لفظ پر زیادہ زور دینے کی عادت، آہستہ آہستہ اور ایک ایک لفظ کو تول کر کہنے یا برعکس اس کے خواہ مخواہ بولنے کی عادت اس نے غیر شعوری طور پر اپنے باپ، اپنے اُستاد یا کسی دوسرے

لڑکے سے سیکھی ہو۔ اسی طرح کبیدگی کی صورت میں خاموش بیٹھے رہنے کی عادت اس نے اپنی ماں سے یا ممکن ہے اپنے باپ سے سیکھی ہو۔

اسی طرح بچہ زیادہ تر غیر شعوری طور پر تقلید سے نیک و بد کو سمجھتا ہے۔ بزدلی سے نفرت، ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کو وقعت سے دیکھنا، کمزوروں پر ترس کھانا، جرأت اور خودداری کا احترام اور دغابازی اور چاپلوسی سے نفرت، یہ سب باتیں اس میں تقلید سے پیدا ہوتی ہیں۔ بچے میں یہ احساس کہ ذمہ داری سے کترانا نفرت کا باعث ہوتا ہے کسی خاص موقع پر اپنے ماں باپ کی مثال سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اندھیرے سے ڈرنے کا احساس ممکن ہے اس میں ماں، بہن، بھائی یا آیا کی تقلید سے پیدا ہوا ہو۔ حکومت کا احترام یا برعکس اس کے حکومت کی مخالفت اور اس پر جا و بے جا نکتہ چینی کی عادت اپنے ماں باپ یا ساتھ کے کھیلنے والوں کی تقلید کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ شکست کے باوجود پست ہمت نہ ہونے اور کوشش میں لگے رہنے کی عادت کی ابتدا تقلید ہی سے ہوتی ہے۔

بچے کی زندگی پر صرف جیتے جاگتے لوگوں کا ہی اثر نہیں ہوتا بلکہ قصے کہانیوں کے سورماؤں کے برے اور بھلے کردار، ان کے خیالات، ان کے احساسات اور ان کے طرزِ عمل سے بھی وہ متاثر ہوتا ہے۔ پھر جب وہ بڑا ہوتا ہے تو ناولوں، افسانوں اور ناٹکوں کے بہادر مرد اور عورتیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ غرض تمام زندگی میں یہ رجحان قائم رہتا ہے اور وہ افسانوی کردار کے جذبات اور اعمال سے اتنا ہی بلکہ بعض صورتوں میں اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے جتنا حقیقی دنیا میں رہنے والوں سے۔

اس طرح مثال اور نادانستہ تقلید سے ابتدا ہوتی ہے جو بعد میں عادت کی

صورت اختیار کرتی ہے اور عادت طبیعتِ ثانی ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ بچّوں کی اس نادانستہ تقلید کی اہمیّت سے واقف ہو جائیں اور یہ ملحوظ رکھیں کہ ان کے بچّے صرف انھیں بچّوں اور بڑے آدمیوں سے ربط ضبط رکھیں جن کا ان پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے اور اپنے بچّوں کو ایسے افسانوں اور فلموں سے دور رکھیں جو خراب مثالیں پیش کرتی ہیں تو آیندہ نسلیں ہم سے بہتر اخلاق و اوصاف کی ہو سکتی ہیں۔ یہ مسئلہ اس قدر مہتم بالشّان اور اس قدر اہم ہے کہ قسمت یا "ہالی وڈ[1]" پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

تقلید اور جتھا

ہمیں دوسروں کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہماری، مانند ہو جائیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو ہم اپنے آپ کو ان کی مانند کر لیں۔ دوسرے لوگوں سے ہمارے زیادہ تر تعلّقات اسی منشا کے ماتحت ہوتے ہیں۔ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے اور ان کے خیالات، احساسات اور طرزِ عمل میں کوئی فرق نہ رہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو نادانستہ تقلید سے ہم اپنے آپ کو ان کے خیالات، احساسات اور طرزِ عمل کے موافق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

تقلید اور دوستی کی خواہش کو "جتھے کی خواہشات" کے ذیل میں رکھا گیا ہے۔ دوستی کی خواہش ہمیں کسی جتھے کے ساتھ ہو جانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے بعد ہی نادانستہ تقلید وقوع میں آتی ہے۔ ہم اپنے جتھے کے ساتھ چلے چلتے ہیں

---

[1] وہ مقام جہاں امریکی فلم کمپنیاں فلم بناتی ہیں۔

اور اپنے خیالات ، احساسات اور طرزِ عمل کو جتھے کے دوسرے افراد کے خیالات ، احساسات اور طرزِ عمل کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خصوصاً ہم چاہتے ہیں کہ اس شخص کی تقلید کریں جو فطری حالت میں جتھے کا سردار کہلا سکتا ہے۔

جتھے کا فرد جتھے کے طریقے اختیار کر لیتا ہے۔ نفسیات کا اگر ہمیں کچھ علم نہ ہو تو ہم مطلق یہ پہچان نہیں سکتے کہ کیوں ہمارے خیالات ، احساسات اور ہمارا طرزِ عمل ایسا ہے۔ اکثر و بیشتر ہم ایک خاص احساس یا عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں کہ ہمارا جتھا بھی وہی احساس اور عقیدہ رکھتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہمارا طرزِ عمل بھی جتھے کی متابعت میں ہوتا ہے اور ہمارا لباس ، ہماری گفتگو کا طریقہ ، ہمارا ضابطۂ اخلاق، عمدہ مذاق کے متعلق ہمارے خیالات ، خوب صورتی کا معیار ، کسی آدمی یا کسی رائے یا طرزِ عمل کے متعلق موازنے کا معیار جتھے کے معیار کے ماتحت ہوتا ہے ۔

کہیں کہیں ہم کو اِکّا دُکّا آدمی ایسے بھی ملتے ہیں جنھیں اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ وہ کسی جتھے کے قیدی نہیں ہیں ۔ ان کا یہ ادّعا ہوتا ہے کہ وہ معمولی آدمی نہیں ہیں جو جتھے کے قیدی رہیں بلکہ آزاد ، ذاتی رائے رکھنے والے اور خود مختار آدمی ہیں جو خود سوچتے اور خود فیصلہ کرتے اور اپنی مرضی کے موافق کام کرتے ہیں ۔

اچھا تو ایسا ہی سہی ۔ مگر ذرا ان لوگوں کو اپنی خود مختاری اور آزادی کا ثبوت دینے کے لیے کہو کہ دوپہر کے وقت بڑے بازار میں نہانے کا لباس اور بولر ہیٹ پہن کر جائیں ، یا یہ کہو کہ بازار میں جب کبھی کسی شناسا عورت سے ملاقات ہو تو ٹوپی سر سے پھینک دیں ، اپنے سینے پر ہاتھ رکھیں اور جھک کر درباری سلام کریں ۔ یہ بالکل معمولی باتیں ہیں لیکن ذرا وہ ان ہی کو کر کے دکھا دیں ۔

یہ ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے اور ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں

کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے جتھے کی نظر میں تمسخر کا باعث ہوں گے اور جتھا ہر اس شخص کا تمسخر اُڑاتا ہے جو جتھے کے ضابطے سے باہر ہوتا ہے تاکہ اس کو اپنے قدیم راستے پر لے آئے۔

جو شخص تمسخر کے خوف سے کوئی کام مجبوری سے کرتا ہے یا کسی کام سے اپنے آپ کو باز رکھتا ہے تو وہ جتھے کا آدمی اور جتھے کا پابند ہے۔

جتھے کے رسم و رواج اور قوانین کی جزئی خلاف ورزی جتھے کے تمسخر کا باعث ہوتی ہے لیکن اہم خلاف ورزیاں قابلِ ملامت اور بد اخلاق ہونے کی وجہ سے قابلِ سرزنش ٹھیرتی ہیں۔

بہت سے قومی اور جماعتی جتھوں کے بالکل مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنے جتھے کے طریقوں کو بالکل بجا اور معقول اور دوسرے جتھے کے طریقوں کو بے جا اور نامعقول سمجھتا ہے۔ تم اس عورت کے متعلق کیا خیال کرو گے جو شاہراہِ عام پر جلیبیاں کھاتی ہوئی جا رہی ہے۔ تمھارا جواب اس خاص جتھے اور سوسائٹی کے اس خاص طبقے کے نقطۂ نظر سے ہوگا جس سے تم کو تعلق ہے۔ اگر دو آدمی سلام کے لیے ایک دوسرے سے معانقہ کرتے اور ایک دوسرے کے گال پر بوسہ دیتے ہیں تو ہمارے قومی جتھے میں اس کو کیوں مضحکہ خیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف اس لیے کہ ہمارے خاص طبقے میں یہ طریقہ رائج نہیں ہے اور ہمارا خاص طبقہ اس طریقے سے سلام نہیں کرتا۔ لیکن جس جتھے میں اس طریقے سے سلام رائج ہے وہاں یہ چیز مضحکہ خیز نہیں۔ اسی طرح ہمارے جتھے میں یہ رائج نہیں ہے کہ اپنی ساس سے جب کبھی ملیں تو دو زانو ہو کر قدم بوسی کے ساتھ تعظیم بجا لائیں۔ لیکن دوسرے جتھے میں یہ فعل بالکل واجبی اور بجا قرار دیا گیا ہے جس کا نہ کرنا نہ صرف قابلِ استہزا ہے بلکہ سخت بد اخلاقی سمجھا گیا ہے۔

۲۷۱۵

ایک انگریز کے نزدیک یہ ایک بالکل واجبی اور بدیہی چیز ہے کہ ایک ہی عورت سے شادی کی جائے۔ برخلاف اس کے ایک تُرک کے نزدیک ایک سے زاید عورتوں سے شادی بالکل جائز اور معقول فعل ہے۔

لوگ عمداً ایک کام اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ان کے جتھے میں رائج ہے بلکہ یہ امر کہ وہ ان کے جتھے میں رائج ہے انھیں یہ سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ وہی اچھا اور اصولی کام ہے اور اس لیے وہ اس کام کو کرتے ہیں۔

بعض اوقات مجمع کے ساتھ چلے چلنے کا جذبہ بہت زبردست ہوتا ہے جیسا کہ حسب ذیل قصّے سے ظاہر ہوگا۔

جہاز لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور ایک مدرسے کے لڑکے نے جہاز سب پھر کر دیکھا تو کہیں بیٹھنے کے لیے اس کو جگہ نہ مل سکی۔ اس نے اپنے جی میں ٹھان لی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے بیٹھنے کے لیے جگہ پیدا کرے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ جگہ کس طریقے سے پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے لیے جہاز کی ایک جانب جاکر وہ سمندر کے پانی کو بہت غور سے دیکھنے لگا اور پھر دفعتہً چلّایا "اوہ! کتنی بڑی ویل مچھلی ہے" یہ سُننا تھا کہ سب لوگ اس طرف پل پڑے۔ جسے دیکھو ویل ہی کو دیکھ رہا اور ویل ہی کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی کسی طرف بتا رہا تھا اور کوئی کسی طرف۔ ادھر تو یہ ہو رہا تھا اور اُدھر لڑکے کو کئی کرسیاں خالی بیٹھنے کو مل گئیں۔ لڑکا آپ ہی آپ خوش ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک کرسی پر پاؤں دراز کیے۔ وہ یہ دیکھ کر خوش تھا کہ احمق لوگ پانی کی طرف دیکھ رہے اور ایک دوسرے کو ایک ایک کندا اور دریائی نرکل بتا رہے تھے جو پانی میں بہتے جا رہے تھے۔ آخر خود لڑکے سے بھی رہا نہ گیا۔ ہر شخص ویل کو تلاش کر رہا تھا وہ بھی معاً اپنی جگہ سے اُٹھا اور مجمع میں مل کر خود بھی ویل کو دیکھنے لگا۔

بعض باتوں میں ہم بکروں سے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ ان کا گوشت کھانا ہمارے لیے آدم خوری سے کم نہیں۔

صید و شکار کی جبلّت

تعاقب اور شکار کرنے کی جبلّت کا تعلق گھیرنے اور گرفتار کرنے کی بنیادی خواہش سے ہے اور یہ بنیادی خواہش کئی طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہوا ہے کہ فطرتاً یہ خواہش عورت میں زیادہ ہوتی ہے یا مرد میں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں میں یہ خواہش نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ بڑے آدمیوں میں یہ خواہش صید و شکار اور مردانہ کھیلوں سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور محبت کی خواہش کے ساتھ مل کر مرد کو مجبور کرتی ہے کہ وہ عورت کو گھیرے۔ غالباً تجار بھی اپنی یہ خواہش اپنے خاص خریداروں کو گھیر کر پوری کرتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں یہی خواہش تحقیق کی خواہش کے ساتھ مل کر دماغی جد و جہد کے لیے بہت بڑی محرّک ہوتی ہے۔

تحقیق کی جبلّت

تحقیق کی جبلّت کھوج اور دریافت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ انسان کی بنیادی طاقتوں کے منجملہ یہ بھی ایک بڑی بنیادی طاقت ہے اور دوسری بنیادی خواہشات کی طرح یہ بھی اپنے آپ کو کئی طریقوں سے ظاہر کرتی اور تکمیلِ مدعا کے ذرائع پیدا کرتی ہے۔ ایک تو محض خالی خولی کھوج ہے جس میں ایک بیش بہا قوت محض رائگاں جاتی ہے لیکن جب اسی خواہش کو کسی خاص کام پر لگایا جاتا ہے تو ہم حقیقی معلومات حاصل کر کے اس خواہش کو پورا کرتے ہیں۔

سائنٹفک تحقیقات اور انکشافات کی بڑی وجہ یہی خواہش ہی اور انسانی تسلط و ترقی کی بے شمار کوششیں زیادہ تر اسی خواہش کی رہینِ منّت ہیں لیکن یہ خواہش رائگاں بھی ہوسکتی ہی جیسے اُڑائی ہوئی جھوٹ موٹ خبروں کے متعلق معلومات حاصل کرنا یا ایک اخبار کے ہر کالم اور ہر صفحہ کے مطالعہ میں بہت سا وقت صرف کرنا۔ افسانوں اور ناٹکوں میں ہماری دلچسپی کی ایک وجہ یہی خواہش ہی جو ہمیں یہ دیکھنے پر مجبور کرتی ہی کہ آگے کیا ہوتا ہی اور انجام کیا ہوگا؟

ناول اور سینما

بہت سے لوگ ناول کیوں پڑھتے اور سینما کیوں دیکھتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ناولوں کے پڑھنے اور سینماؤں کے دیکھنے سے دل بہلانا مقصد ہوتا ہی معقول جواب نہیں ہوسکتا۔ سوال یہ ہی کہ دل کس وجہ سے بہلتا ہی اور کیوں ایک شخص ایک ناول اور ایک کھیل کو پسند کرتا ہی تو دوسرا شخص دوسرے ناول اور دوسرے کھیل کو؟

اس کو سمجھنے سے پہلے ہم کو ''ہم زادی'' (Empathy) کا مفہوم سمجھنا ضروری ہی۔ ''امپتھی'' مطالعہ کرنے یا تماشا دیکھنے والے کی اس حالت کا نام ہی جس میں وہ وقتی طور پر اپنے آپ کو بالکل بھول جاتا اور اس کردار میں سمویا جاتا ہی جس کو وہ ناول میں پڑھتا یا پردے پر دیکھتا ہی۔ یہ سمجھ لو کہ ہم عالمِ خیال میں دوسرے کی جگہ لے لیتے اور اس کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مدرسے کا لڑکا جنوبی سمندر کے قزاق یا مغربی خطّے کے جانبازوں یا کوئی جیالے جاسوس کا قصّہ گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ

کرتا ہے تو ہم کو اس میں ذرا بھی شبہ نہ ہونا چاہیے کہ لڑکے نے عالمِ خیال میں اس ناول کے ہیرو کی جگہ لے لی ہے۔ لڑکا اب ہیرو ہے اور اصل میں وہی اب اس مفسدانہ سازش کا پتا چلاتا اور بدمعاش کو سیدھا کرتا ہے۔ اور وہی ان تمام زبردست معرکوں اور جان جوکھوں اور خطروں سے جیت کر نکلتا ہے جو ناول میں بیان کیے گئے ہیں۔

لیکن یہ ہم زادی (Empathy) صرف مدرسے کے لڑکے اور افسانوی معرکوں کی حد تک محدود نہیں ہے، ہر شخص کو اس سے سابقہ پڑ سکتا ہے بشرطیکہ قصّہ پڑھتے یا کھیل دیکھتے وقت وہ محسوس کرے کہ اِس قصّے یا کھیل کے کردار میں وہ جذب ہو گیا ہے۔

افسانوں کے مطالعہ سے ہم مختلف مسرتیں حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ مسرتیں اس ناقابلِ بیان مسرت کے مقابلے میں ہیچ ہوتی ہیں جو اکثر لوگ نادانستہ طور پر افسانے کے کسی ایک کردار میں سموئے جا کر حاصل کرتے ہیں۔ جب کبھی تم کسی افسانے یا فلم میں ہمہ تن محو ہو گئے ہو اور تمھیں اپنی خبر نہیں رہی ہے تو تمھیں غور کرنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ تم نادانستہ طور پر اس وقت افسانے کا ایک کردار بن گئے تھے۔

بعض اوقات ایک شخص کو ہم یہ کہتے سنتے ہیں کہ اس افسانے کو پڑھتے یا اس فلم کو دیکھتے وقت مجھ پر فراموشی کا عالم طاری تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ فراموشی کی وجہ سے مسرت کیوں حاصل ہوتی ہے۔ صریحًا اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانے یا فلم کے کردار میں اپنے آپ کو سمو کر ہم قائم مقامانہ حیثیت سے اپنی اس خواہش کی تکمیل کرتے ہیں جو اصلی زندگی میں تشنہ رہتی ہے۔

مدرسے کے اس لڑکے کو دیکھو جس نے افسانۂ حادثات میں اپنے آپ کو

فراموش کر دیا ہے۔ ہر صحیح و تندرست لڑکا حادثات اور ہیجان کا دل دادہ ہوتا ہے تاکہ اپنی بہادری اور لوگوں پر اپنے تسلط اور قیادت اور حقیقی زندگی کی پابندیوں اور قیدوں سے آزادی کی خواہش کی تکمیل کرے۔ حقیقی زندگی میں اس کی یہ آرزوئیں پوری نہیں ہوسکتیں اور یہ اسی وقت پوری ہوتی ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو افسانے کا ہیرو تصور کرتا ہے۔ حقیقی زندگی میں اس کی ہستی کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ لیکن ہیرو تصور کر کے وہ ایک قابلِ قدر ہستی ہو جاتا ہے جس پر جمہور کی نگاہیں پڑتی ہیں اور جو لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس طرح افسانے یا فلم کے ذریعے وہ ان خواہشات کو پورا کرتا ہے جو حقیقی زندگی میں پوری نہیں ہوتیں۔

ہماری خواہشات مختلف ہوتی ہیں اور حقیقی زندگی میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ہماری تمام خواہشات پوری ہوں جو اکثر متضاد ہوتی ہیں۔ اگر ہم حقیقی زندگی میں ایک خواہش کی بجا آوری کرتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ کوئی دوسری خواہش ناتمام رہے۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ اطمینان و فراغت سے رہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں نئے وقائع اور نئے تجربات و اتفاقات پیش آئیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں وقتِ واحد میں میسر نہیں ہوسکتیں۔ پھر ان متضاد خواہشات کی تکمیل ہو تو کیوں کر ہو۔ آج کل عام طور پر ان ہر دو خواہشات کی تکمیل کا جو طریقہ رائج ہے وہ یہ ہے کہ اطمینان و فراغت کی فکر حقیقی زندگی میں کرتے ہیں اور پھر تازہ تجربات و حادثات کے لیے ناولوں اور فلموں کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

بہت سے لوگ حد سے زیادہ مزاحیہ کھیلوں کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ تربیت تعلیم اور رائے عامہ کے خیال کی وجہ سے ہمارا طرزِ عمل مہذب اور مقررہ معیار کے ماتحت ہوتا ہے۔ یہ تو اوپری حد تک ہے لیکن ہمارے اندر بالکل فطری طریقے کے اور آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے وہی قدیم

جذبات اب بھی موجود ہیں۔ جب کبھی ہم اپنے آپ کو معیاری بندھن سے علیحدہ کر لیتے ہیں تو ہمیں ایک گو نہ تسلی ہوتی ہے۔ اس بندھن کی علیحدگی سے ہمارا مطلب معمولی پابندیوں اور ضوابط کو بالائے طاق رکھنا اور فطری نامہذب اور ناشائستہ آدمی کی طرح رہنا بسنا ہے۔ گو شائستگی اور مقررہ آداب کے ہم خوگر ہو گئے ہیں لیکن ہمارے اندر ایک دوسری فطرت بچہ یا آزاد اور وحشی انسان کی موجود ہے جس کو ہم نے شکست دی اور رام کر کے مقید کیا ہے اور جب ہم سنیما یا ناٹک کا مسخرا اپنے آپ کو تصور کرتے ہیں تو اس دوسری فطرت کو بھی اظہار کا موقع مل جاتا ہے۔ یہ مسخرا وہ تمام کام کرتا ہے جو ہماری وحشی، نامہذب اور ناشائستہ فطرت ہم سے کرا سکتی ہے۔ یہ مسخرا آن بان سے رہنے والے بھاری بھرکم لوگوں کا مذاق اُڑاتا اور ان کی پیٹھ پر گھونسہ لگا کر ان کو گراتا ہے اور جو کوئی خوب صورت عورت اسے نظر آجاتی ہے اس کے نزدیک جاتا اور جھٹ سے اس کا بوسہ لے لیتا ہے۔ حکومت سے وہ سرکشی کرتا ہے، کھانا وہ پھینک دیتا ہے، چیزوں کو وہ توڑتا پھوڑتا ہے اور جو چیز چاہتا ہے اس کو چھین لیتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام کام انجام دیتا ہے جنھیں ہم کرنا چاہتے تھے جب ہم بچے تھے لیکن ہم کو انھیں نہ کرنے کے لیے تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ اس طرح سے وہ ان جذبات کو آشکارا کرتا ہے جو ہم میں بوجہ تربیت دبائے گئے ہیں۔

اپنی حقیقی زندگی کی کوتاہیوں کا معاوضہ کرنے کے لیے ہم افسانے اور فلم دیکھتے ہیں۔ اگر ایک شخص کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ اس کو کس قسم کے افسانوں اور فلموں سے زیادہ دلچسپی ہے تو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اس شخص کی حقیقی زندگی میں کون سی خواہشات ظاہر اور بار آور نہیں ہوئی ہیں (لوگ جب اپنی پسند کے افسانوں اور فلموں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو وہ اپنے متعلق اکثر اس سے زیادہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں جتنا وہ خیال کرتے ہیں)۔ تازہ تجربات اور واقعات سے گزرنے کی خواہش اکثر

مردوں اور عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ روزمرہ کی سیدھی سادی اور ایک حالت کی زندگی کو پسند نہیں کرتے اور اسی لیے حادثاتی افسانے اور فلموں کی زیادہ مانگ ہے۔ بعض لوگوں کی سوسائٹی میں سربرآوردہ ہونے کی خواہش پوری نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ ان ناولوں اور فلموں کو دیکھتے ہیں جو بڑے امرا اور رؤسا کی زندگی کے متعلق ہوتے ہیں جن میں ایک معمولی مزدور پیشہ عورت ایک بڑے لکھ پتی سے شادی کرتی ہے۔ ہزاروں مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو حقیقی زندگی میں محبت سے ناآشنا ہوتی ہیں اور محبت سے آشنا ہونے کی خواہش غیر شعوری طور پر ان میں موجود ہوتی ہے۔ اس طرح ایک عورت ایک ایسے افسانے اور فلم کو دلچسپی سے دیکھتی ہے جس میں ہیروئن سے (جو غیر شعوری طور پر وہ اپنے آپ کو تصور کرتی ہے) ایک ایسا آدمی محبت کرتا ہے جو اس کا دل دادہ ہوتا ہے۔ شاید اس کا شوہر ایک پست قامت، موٹا اور دبیل قسم کا آدمی ہے لیکن اس کی فطرت یہ پسند کرتی ہے کہ کوئی زبردست طاقتور مرد اس پر حکم رانی کرے۔ ایسی صورت میں وہ ان افسانوں کو پسند کرے گی جن میں اس کی اس خواہش کی تکمیل ہوسکتی ہے۔ چند سال پہلے ایک افسانہ نویس نے افسانوں کا سلسلہ شائع کیا تھا جس کے ہر افسانے میں ایک عورت چالیس پینتالیس سال کی اور اس پر مرنے والا ایک بیس اکیس سال کا خوب صورت نوجوان ہوتا تھا۔ ایک دو سال تک یہ افسانے متوسط طبقے کی عورتوں میں (جن کی عمر چالیس اور پچاس سال کے درمیان ہوگی) بہت مقبول ہوئے۔

عموماً چار خواہشیں ایسی ہیں جو اکثر حقیقی زندگی میں پوری نہیں ہوتیں اور ان کو پورا کرنے کی غرض سے لوگ عموماً افسانے اور فلم دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایسے افسانے اور فلم عوام الناس میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔ یہ خواہشات

حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) عاشقانہ محبّت کی خواہش۔

(۲) دولت اور حکومت کی خواہش۔

(۳) ممیز ہستی اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کی خواہش۔

(۴) ہیجان اور حادثات کی خواہش (یعنی حملہ کرنا، تعاقب کرنا اور بھاگنا)

تم دیکھو گے کہ ان خواہشات کی تکمیل کس طرح اکثر و بیشتر فلموں اور ناولوں سے ہوتی ہے۔ نیز اگر تم غور کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس قسم کے ناول اور فلم سے ایک خاص شخص زیادہ متاثر ہوتا ہے اور اس شخص کی حقیقی زندگی میں کون سی خواہشات ایسی ہیں جو مناسب طور پر ظاہر نہیں ہو رہی ہیں۔

تم جس شخص کا مطالعہ کر رہے ہو اس کے متعلق کس حد تک متذکرۂ صدر امور سے روشنی پڑتی ہے اور کون سی بنیادی خواہشات اس میں ایسی ہیں جو حقیقی زندگی میں پوری نہیں ہوئی ہیں۔

خود تمھارے متعلق ان امور سے کس حد تک روشنی پڑتی ہے۔ حقیقی زندگی میں تمھاری وہ کون سی کوتاہیاں ہیں جن کا بدل تم ناولوں اور فلموں کے ذریعے سے کرتے ہو۔ اگر کوئی کوتاہیاں تم میں نہیں ہیں تو ناولوں اور فلموں سے تمھاری تفریح نہیں ہو سکتی۔

معیار

ہم پھر ان بڑی بنیادی خواہشات کو نیچے درج کیے دیتے ہیں جو ہر صحیح مرد اور عورت میں ضرور پائی جاتی ہیں۔

تم ہر بنیادی خواہش پر غور کرو اور دیکھو کہ یہ کس طرح تمھاری زندگی میں اپنے آپ کو نمایاں کرتی اور پوری ہوتی ہے اور وہ کون سی بنیادی خواہشات ہیں جو خاطر خواہ

نمایاں اور پوری نہیں ہوتیں -

اگر تم کسی شخص کے کردار کا مطالعہ کر رہے ہو یا اس کے طرزِ عمل کو بدلنا چاہتے ہو تو غور کرو کہ کن بنیادی خواہشات کی اس شخص میں بخوبی نشو و نما ہوئی ہے - پھر دیکھو کہ ہر خواہش کس طریقے سے اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے اور وہ کون سی خواہشات ہیں جو اچھی طرح سے ظاہر نہیں ہو رہی ہیں یا نا مناسب طریقوں سے ظاہر ہو رہی ہیں اور تم کس طرح اس خواہش کے بہتر طریقے سے ظاہر ہونے کی تدبیر کر سکتے ہو -

ہر صحیح مرد اور عورت کی بنیادی خواہشات (اور احتیاجات)
(ان کی ترتیب سہولت کے لحاظ سے رکھی گئی ہے)

۱ - جسمانی آرام

۲ - حفاظت

۳ - بچنا

۴ - اس شخص کی رضا جوئی اور دل میں گھر کرنے کی خواہش جو نقصان پہنچا سکتا ہے -

۵ - (۱) اپنے آپ کو دکھانے (۲) تحسین حاصل کرنے اور (۳) محبّت کیے جانے کی خواہش -

۶ - ضرر و ایذا رسانی، غالب ہونے اور حکومت کرنے کی خواہش - برتری کا احساس -

۷ - جنسِ مخالف کو اپنی طرف مائل کرنے ، اس کو خوش کرنے اور ازدواجی حیثیت سے رہنے کی خواہش -

۸ - کسی کی (جیسے بچّے کی) دیکھ بھال اور حفاظت کی خواہش جو نسبتہً کمزور ہے -

۹ - اپنے ہم جنسوں کی دوستی اور ہمدردی کی خواہش -

۱۰۔ اپنے جتھے کی مانند خصوصاً اس کے سربرآوردہ افراد کی مانند رہنے کی خواہش۔
۱۱۔ پکڑنے اور گرفتار کرنے کی خواہش۔
۱۲۔ دریافت کرنے، جاننے اور سمجھنے کی خواہش۔
۱۳۔ شناسا اشخاص، مقامات اور حالات کی طرف لوٹنے کی خواہش۔

ہمارے اندرونی اختلافات

ہماری مختلف خواہشات اور جذبات میں اکثر تصادم ہوتا ہے۔ ان ہی میں سے کسی کا رجحان ایک خاص طریقۂ عمل کی طرف ہوتا ہے کسی کا بالکل اس کے خلاف دوسرے طرزِ عمل کی طرف اور یہ دونوں طریقے ایک دوسرے سے متضاد ہو سکتے ہیں۔ ہم کبھی ایک طریقے کی طرف مائل ہوتے ہیں تو کبھی دوسرے طریقے کی طرف ؛ دونوں طریقے ہم اختیار نہیں کر سکتے۔ دونوں میں باہمی تصادم ہوتا ہے۔ ہم کبھی ایک چیز چاہتے ہیں تو کبھی دوسری چیز۔ اور صورتِ حال اور واقعات دونوں چیزوں کے وقتِ واحد میں حاصل کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔ اس طرح ہمارے اغراض کبھی ایک قسم کے تو کبھی بالکل اس کے برعکس قسم کے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان اغراض میں باہمی تصادم ہوتا ہے۔ ہماری زندگی اسی کشمکش میں گزرتی ہے۔ پہلے ایک چیز کو تو بعد میں دوسری چیز کو اختیار کرتے اور اس طرح ہم اپنے ہی اندر آپ اختلافات رکھتے ہیں۔

ہر شخص کی زندگی کے ساتھ یہ اندرونی اختلافات لگے ہوئے ہیں۔ بعض بلکہ اکثر اختلافات جزوی امور میں ہوتے ہیں جن کا تصفیہ کرنے میں دیر نہیں لگتی لیکن بعض اختلافات بہت اہمیت رکھتے ہیں جو ہماری زندگی کو درہم برہم کر دیتے، ہمارے سکون و اطمینان پر ضرب کاری لگاتے، ہماری صحت کو تباہ اور ہماری قابلیت اور مستعدی کو ملیامیٹ

کر دیتے ہیں۔ بعض اہم اختلافات ہفتوں، مہینوں اور برسوں ہمیں پریشان رکھتے ہیں۔

ہم اولاً معمولی روزمرہ زندگی کی مثالوں سے ان اختلافات کی توضیح کریں گے۔ فرض کرو کہ تم کو اچار پسند ہے لیکن یہ بھی ہم فرض کرتے ہیں کہ جب کبھی تم اچار کھاتے ہو تو تمھاری طبیعت میں گرانی سی رہتی ہے، لیکن باوجود اس کے تم کو اچار سے رغبت ہے۔ تمھارے سامنے دسترخوان پر اچار رکھا ہوا ہے۔ اب تم اچار کھانے یا نہ کھانے کے متعلق سوچتے ہو۔ اس وقت دونوں خواہشیں ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور تم اچار کھا کر یا نہ کھا کر اس اندرونی جنگ کا تصفیہ کر دیتے ہو۔

دیانت داری کی عادت تمھاری اس وقتی خواہش سے جنگ کر سکتی ہے جو اپنی تکمیل بد دیانتی سے کرنا چاہتی ہے۔ اسی طرح اظہار شخصیت کا وقتی جذبہ ہمارے جتھے کے مطابق رہنے کے میلان سے ٹکراتا ہے۔ جنگ میں گولہ باری کے وقت ایک سپاہی فریضہ اور اطاعت کے احساس سے ایک طرف مجبور ہوتا ہے جس کی کمک پر اظہار شخصیت اور جتھے کی خواہشات ہوتی ہیں تو دوسری طرف خوف اسے مجبور کرتا ہے کہ بیک بینی و دوگوش فرار ہو جائے۔

ہم سب کو اس وقت کی اندرونی کشمکش کا تجربہ ہوا ہے جب کہ ہمیں ایک نامعقول آدمی سے سابقہ پڑا تھا اور ہم وقتی جذبے کے تحت اس کو جو کچھ وہ ہے صاف صاف کہہ دینا چاہتے تھے لیکن پھر اس خیال سے چپ ہو رہے کہ کہیں تماشا نہ بن جائیں۔

اب زندگی کی بڑی کشمکشوں کو دیکھو۔ ایک شخص کے حوصلے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ایک جگہ شادی بھی کرنی چاہتا ہے جو اس کی آیندہ ترقیوں

کے راستے میں روڑا ثابت ہوگی۔ ایک طرف ہماری اولوالعزمیاں ہمیں آگے بڑھنے پر اُبھارتی ہیں تو دوسری طرف سینکڑوں خواہشیں ہمیں پکڑ پکڑ کے روکتی ہیں کہ آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں اور جیسی کچھ گزر رہی ہے گزارے چلے جائیں۔ یہ کشمکش ایک دو دن نہیں بلکہ سالہاسال رہتی ہے۔ ایک عورت میں مامتا کی خواہش سوسائٹی میں چمکنے کی خواہش کے ساتھ کشمکش کرتی ہے۔ ایک مرد میں سرکاری فرائض کی انجام دہی کی خواہش گھر کے فرائض کی انجام دہی کی خواہش سے بر سرِ جنگ ہوتی ہے۔ ایک دوسرا شخص چاہتا ہے کہ اس کے کاروبار بھی اچھی طرح سے چلیں اور وہ تعلیم و تربیت بھی حاصل کرے۔ ایک عورت چاہتی ہے کہ اپنے عاشق سے شادی کرے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ وہ اپنی آزادی بھی قائم رکھے۔

پھر مقتضائے وقت کے لحاظ سے ہم چاہتے ہیں کہ ادھر اُدھر بھٹکتے نہ پھریں اور کسی ایک مقصد کے ساتھ زندگی گزاریں۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہماری اور کچھ آرزو نہیں ہوتی۔ ہماری آرزوئیں تو بہت کچھ ہوتی ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا تن و توش بھی خوب رہے اور ہم خوب صورت بھی رہیں۔ لباس بھی ہمارا اچھا رہے، پہلوان بھی ہم بنیں، ایک لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی بھی رہے، ظریف بھی کہلائیں، سوسائٹی کے بذلہ سنجوں میں ہمارا شمار رہے، چالاک اور گانٹھ کے پورے ہوں، عورتیں ہم پر ریجھیں، فلسفی بھی مشہور ہوں، مخیر، مدبر، بہادر، محقق، سُریلی آواز کے شاعر، پیرِ کامل وقتِ واحد میں ہوں لیکن یہ ناممکن ہے۔ لکھ پتی اور پیرِ کامل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ چالاک اور گانٹھ کا پورا اور مخیر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ فلسفی اور عورتوں کو گرویدہ کرنے والا دو منٹ مل کر نہیں گزار سکتے۔ ابتدائی زندگی میں یہ سب

کردار ممکن نظر آئیں لیکن کسی ایک کردار کو اختیار کرنے کی صورت میں باقی کرداروں سے کم وبیش دست بردار ہونا ضروری ہے" (ولیم جیمس)

ایک آئرستانی کیتھولک فرقے کے آدمی اور ایک پادری میں قیامت کے متعلق حسب ذیل گفتگو قابلِ ذکر ہے:-

کیتھولک (جس کا نام پٹرک ہے) کیا پادری صاحب آپ بھی وہاں رہیں گے؟

پادری - ہاں پٹرک میں رہوں گا۔

پٹرک - کیا سب کیتھولک فرقے والے وہاں ہوں گے؟

پادری - ہاں سب کیتھولک وہاں ہوں گے۔

پٹرک - اور کیا سب پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ بھی رہیں گے؟

پادری - ہاں پٹرک وہ بھی رہیں گے۔

پٹرک - تب تو قیامت میں شروع دن کوئی کام وام نہ ہو سکے گا۔

جس وقت تک ہماری اندرونی زبردست قوتیں آپس میں ایک دوسرے سے سخت کشمکش کرتی ہیں ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔

اس اندرونی کشمکش کا بدترین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری عصبی قوت بالکل تہس نہس ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش کی وجہ سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ کہ خیال وعمل کی قوت ہم میں سے بالکل سلب ہوگئی ہے۔ پریشان دماغی سے نہ تو ہم کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ کچھ کر سکتے ہیں۔ جو قوت فکر وعمل کے لیے کام آسکتی تھی وہ خانہ جنگی میں صرف ہو جاتی ہے۔ ایک خواہش دوسری خواہش کا سر توڑتی ہے اور اس طرح ہم دنیا کی نظروں میں بے جان و مردہ دل نظر آتے ہیں۔

بعض اوقات خواہشات اور اغراض میں تصادم غیر شعوری ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہم کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ تصادم بھی ہوا ہے۔ ہم صرف اس قدر محسوس کرتے ہیں

کہ ہماری زندگی سکون و اطمینان کی نہیں ہے۔ اور دیکھنے والے لوگ یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ہم میں کچھ قوت اور گرمی نہیں ہے بلکہ ہم کمزور ہیں۔

اس کا علاج کیا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اندرونی اختلاف کی نوعیت سے واقف اور اس کی اصلاح کی طرف رجوع ہوں۔

اکثر و بیشتر صورتوں میں معمولی سمجھ کا آدمی بھی اپنے اندرونی اختلافات کا پتہ خود چلا سکتا ہے۔ اگر اس مختصر کتاب کے مضامین کو بخوبی ذہن نشین کر لیا جائے تو اکثر صورتوں میں بغیر کسی دشواری کے ہم اپنی خواہشات اور ارادوں سے بنیادی خواہشات کو معلوم کر سکتے ہیں اور فہرست مندرجہ صفحہ (۱۵ - ۱۷) کو اچھی طرح سے سمجھنے کے بعد ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہر بنیادی خواہش ہماری زندگی میں کس طریقے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصّوں میں ان مختلف طریقوں کی طرف رہ نمائی کی گئی ہے جن کے ذریعے خواہشات اپنے آپ کو ظاہر کر سکتی ہیں۔ اس طرح بتدریج ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم اپنی طبیعت اور فطرت کو اچھّی طرح سے جاننے کے قابل ہیں اور ہمارے اندرونی اختلافات اور مختلف خواہشات میں تصادم کی نوعیت کو معلوم کرنا ہمارے لیے کچھ دشوار نہیں ہے۔ البتہ شرم کا غلط احساس ہی ایک ایسی چیز ہے جو اس معلومات کے بعد بھی ہماری شکست کا باعث ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ ہماری بنیادی خواہشات بھی بُری اور بھلی ہوتی ہیں لیکن یہ غلطی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہم نے اس چھوٹی سی کتاب میں یہ اچھی طرح سے واضح کیا ہے کہ ہماری بنیادی خواہشات بذاتِ خود نہ اچھی ہیں نہ بُری، نہ تو قابلِ تحسین ہی ہیں اور نہ قابلِ شرم۔ بھلائی یا بُرائی بُنیادی خواہش میں نہیں ہوتی بلکہ اس خاص طریقے میں ہوتی ہے جس کے ذریعے بنیادی خواہش ظاہر اور پوری ہوتی ہے۔

خواہشات کے باہمی اختلافات کا علم ہو جانے پر ان کو کیوں کر سلجھایا جا سکتا ہے۔ ان کو سلجھانے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہماری بنیادی خواہش کی بجا آوری سینکڑوں اور ہزاروں طریقوں سے ہو سکتی ہے لہٰذا ہمارے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ **بنیادی خواہش کس طریقے سے پوری کی جائے**۔ ہر بنیادی تحریک کا کسی نہ کسی طریقے سے ظاہر ہونا اور ہر بنیادی خواہش کا کسی نہ کسی طریقے سے پورا ہونا ضروری ہے۔ اگر موجودہ صورت میں خواہش کسی خاص طریقے سے پوری ہو رہی ہے تو ہمارے لیے کسی دوسرے طریقے کو معلوم کرنا ضروری ہے تاکہ اس طریقے سے اس خواہش کو پورا کیا جا سکے اور اس طریقے سے تکمیلِ مدعا میں ہم لگے رہیں۔
یہ تدبیر ہمیشہ کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن اکثر صورتوں میں کامیابی ممکن ہے بنیادی خواہشات کی فہرست پر غور کرنے کے بعد اکثر صورتوں میں ہم خواہش کے اظہار اور تکمیلِ مدعا کے لیے موجودہ طریقے کی بجائے جس پر اب ہماری توجہ مرکوز ہے کوئی دوسرا طریقہ دریافت کر سکتے ہیں۔

پُرانے طریقوں کی بجائے نئے طریقے

بنیادی خواہشیں کم و بیش سب آدمیوں میں ہوتی ہیں۔ دو شخصوں کی طبائع میں زیادہ فرق اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو مختلف طریقوں سے پورا کرتے ہیں۔
اگر ہم کسی آدمی (خواہ ہم ہوں یا اور کوئی شخص) کے طرزِ عمل یا کردار کو کسی حیثیت سے بدلنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک صورت یہی ہو سکتی ہے کہ پُرانی خواہش کی بجا آوری کے لیے کسی نئے راستے کی طرف رہ نمائی کریں۔

بچّوں میں بُرے رجحانات کی اصلاح اسی طریقے سے کی جا سکتی ہے، اسی طریقے سے تاجر اپنے خریداروں کو کسی خاص سامان کی خریداری کے لیے ترغیب دیتے ہیں اور کامیاب پروپیگنڈے میں یہی اصول کارفرما ہوتا ہے اور اسی طریقے سے لوگوں کے طرزِ عمل کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔

کسی طرزِ عمل کو بدلنے کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کون سی بنیادی خواہش اس طرزِ عمل سے پوری ہو رہی ہے۔ بہت سے خطاوار نوجوان خطا کا ارتکاب اپنے جتھے کی نظر میں اپنے آپ کو چالاک ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں یا تو ان کو اس جتھے سے علیحدہ کرنا مناسب ہے اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ ان کا تعلق کسی دوسرے جتھے سے کیا جائے یا ایسے اسباب ان کے لیے فراہم کیے جائیں جن کے ذریعے وہ اپنی شخصیت کو سوسائٹی کے حق میں مُضر کام کرنے کی بجائے مفید کام کرکے ظاہر کر سکیں۔

ہماری ناخوشی کی زیادہ تر وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم نے اپنی بنیادی خواہش کو ایک ایسی چیز پر مرکوز کیا ہے جس کا حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ اس چیز سے دست کش ہو جائیں اور اس کے بغیر زندگی گزاریں بلکہ ہمیں کرنا یہ چاہیے کہ کسی دوسری چیز پر اپنی توجہ مبذول کریں جو بنیادی ضرورت کو پورا کرتی ہو اور جس سے بنیادی خواہش پوری ہوتی ہو (پھر ایک بار ہمارے قارئین صفحات ۶۴ و ۶۵ ملاحظہ کریں)۔

حصّۂ سوم

شخصی کردار کی تخلیق

جو کچھ اب ہم ہیں وہ کس طرح ہوئے؟

آیندہ صفحات میں ہم بتائیں گے کہ شخصی کردار کیوں کر بنتے اور کیوں کر مختلف آدمی مختلف طریقوں سے اپنی بنیادی خواہشات پوری کرتے ہیں۔

اب جو کچھ ہم بیان کریں گے اس کا تعلق اس بیان سے ہے جو غیر شعوری تقلید کی اہمیت کے متعلق اوپر گزر چکا۔

ان صفحات میں ہم زیادہ تر ابتدائی. بچپن کے تجربات اور ان کے تاثرات کو بیان کریں گے کیوں کہ بچپن ہی میں کردار کی داغ بیل پڑتی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہ تجربات اور ان کے تاثرات صرف بچپن ہی میں مترتب ہوتے ہیں۔ تمام زندگی میں یہ عمل ہوتا رہتا ہے لیکن بچپن کا دور گزرنے کے بعد عادتیں سخت ہو جاتی ہیں اور تبدیلیوں اور موقعوں سے فائدہ اُٹھانے کا امکان بہت کم رہتا ہے۔

قیمت

فطرتِ انسانی کے سمجھنے کے لیے یہاں ہم ایک گُر کی بات بیان کرتے ہیں جس سے ہر فرد بشر کو سمجھنے میں ہمیں مدد مل سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی قیمت وہ ہے جو اس نے ادا کی ہے اور محض جبلی طرزِ عمل کو چھوڑ کر ہر شخص وہ کرتا ہے جس کی قیمت اس نے ادا کی ہے۔

ہر شخص کی قیمت وہ ہے جو اُس نے ادا کی ہے
ہر شخص وہ کرتا ہے جس کی قیمت اس نے ادا کی ہے

اس سے کہیں غلط فہمی نہ ہو جائے۔ ہم نے " قیمت " کو بہت وسیع معنی میں استعمال کیا ہے۔ ہمارے نزدیک قیمت کے معنی ہیں کسی قسم کی مسرت یا حظ سے تمتع حاصل کرنا۔ اس سے یہ مفہوم نہ لیا جائے کہ قیمت کا تعلق صرف مادی منفعت سے ہے یا حظ محض جسمانی ہی ہونا ضروری ہے نہیں، بلکہ یہ حظ دماغی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ ایک عقیدہ، ایک احساس یا کوئی فعل قیمت پیدا کرتا ہے جب کہ نتیجۃً اس سے کسی قسم کا حظ یا مسرت کسی بنیادی خواہش یا کسی پیدا کردہ خواہش کے پورے ہونے کی وجہ سے حاصل ہو۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہر وقت حظ یا مسرت حاصل ہونا ضروری ہے یا یہ کہ یہ حظ یا مسرت وقتی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ ابتدا میں حظ یا مسرت کا ہونا ضروری ہے جب کہ عادات کی داغ بیل پڑتی اور شخصی کردار بننے لگتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارا موجودہ طرزِ عمل اس شعوری یا نیم شعوری خیال کے تحت ہوتا ہے کہ ہمیں اس سے کس قدر حظ اور مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن یقیناً

ہمارے تمام موجودہ احساسات اور طرزِ عمل کی یہ لم نہیں قرار دی جاسکتی ۔ بعض اوقات ہمارا طرزِ عمل یا ہمارے عقاید اور احساسات ایسے ہوتے ہیں جن سے کسی قسم کا بھی حظ یا مسرت حاصل ہونے کی توقع نہیں ہو سکتی ۔ پھر ایسے طرزِ عمل کی جو نتیجہ خیز نہ ہو کیا توجیہ ہو سکتی ہے ۔

ایسے طرزِ عمل کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ اس کو ہم نے اس وجہ سے اختیار کیا ہے کہ ہماری فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے لیکن پھر اس فطرت کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے ۔ اس توجیہ کے لیے پھر ہم اسی اصول پر لوٹتے ہیں کہ گو اب ہمیں حظ اور مسرّت نہ ہو لیکن ہمیں اس طرزِ عمل سے ابتدا میں ضرور حظ اور مسرّت حاصل ہوئی جبکہ ہماری خصوصیات، ہماری عادات اور شخصی کردار بن رہا تھا ۔ گو اب ہم کو اس طرزِ عمل سے مسرت حاصل نہ ہو لیکن ہم نے کسی نہ کسی وقت ضرور حظ و مسرت حاصل کی ہے ۔

اس قسم کے خیال ، احساس یا طرزِ عمل نے جس وقت تک ہمارے اندر گھر نہیں کرلیا اس وقت تک ہم حظ و مسرّت حاصل کرتے رہے ہیں ۔ ہم میں یہ مسرّت اندوزی اُس وقت تک رہتی ہے جب تک اس قسم کا تخیل یا احساس یا طرزِ عمل ہم میں طبیعت ثانی نہیں ہو جاتا ۔ اس کے بعد ہم عمر بھر وہی تخیل وہی احساس اور وہی طرزِ عمل قائم رکھتے ہیں ۔ جب ایک بار ایک وضع قائم ہوگئی تو وہ قائم ہی رہتی ہے اور ہم اسی وضع کے ہو جاتے ، اسی وضع کے مطابق عمل پیرا ہوتے اور اسی وضع کے مطابق سوچتے اور ویسا ہی احساس رکھتے ہیں گو اس طرح سے رہنے میں ہم کو حظ و مسرّت نہ ہو بلکہ تکلیف اور نقصان پہنچے ۔

اس طرح معاشری خدمت کی عادت ، محنت کی عادت ، اور وفاداری کی عادت ، حب الوطنی کی عادت ، سچائی اور راست بازی کی عادت ، بے لاگ کہنے کی عادت ، محنت یا کاہلی کی

عادت ، خاموشی کی عادت ، ضبطِ نفس کی عادت ، یہ تمام اور ان کے علاوہ اور بہت سی عادتیں ابتدا میں (جب کہ ان کی داغ بیل پڑ رہی تھی) مسرت بخش تھیں۔ جب یہ ہماری طبیعت میں ایک بار گھل مل جاتی ہیں تو پھر نہیں جاتیں اور اور چھوٹا بچہ بڑا ہو کر بھی اسی عادت پر قائم رہتا ہے۔

اگر ابتدا میں سچائی اور راست بازی سے تکلیف ہو تو پھر سچائی اور راست بازی طبیعتِ ثانی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر ابتدا میں ان سے مسرت حاصل ہو اور ایک عرصے تک ان عادتوں پر قائم رہ کر بھی مسرت حاصل ہو تو پھر یہ عادتیں بتدریج راسخ ہو جاتی ہیں اور ان عادات کا حامل اس کردار سے موسوم ہو جاتا ہے۔ بچپن ، نوجوانی اور نوجوانی کے بعد کے زمانے میں یہ عادتیں قائم رہتی ہیں اور ایسا شخص تمام عمر راست باز اور سچا رہتا ہے گو ان عادتوں سے اس کو مسرت حاصل نہ ہو بلکہ برعکس اس کے کسبِ معاش پر بھی ان سے اثر پڑتا ہو اور رہتے کہ جان کے بھی لالے پڑ جائیں۔ یہی حال دوسرے اخلاقی اور معاشری (ناشائستہ اور غیر معاشری) جذبات و عادات کا ہے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ والدین و اساتذہ اس اصول سے واقف ہوں اور اس سے کام لیں۔ وہ یہ دیکھیں کہ اچھے کام کرنے سے بچے کے دل میں مسرت پیدا ہو (اور یہ کسی نہ کسی طریقے سے تعریف و تحسین سے یا اپنی خوشنودی کا اظہار کر کے یا بچے کا دل بڑھا کر پیدا کی جا سکتی ہے)۔ بُرے کام سے ان میں مسرت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ اس طرح اور خود اپنے طرزِ عمل سے اچھی عادتیں اور عمدہ اخلاق سکھائے جا سکتے ہیں۔ بچوں میں عمدہ عادات و خصایل پیدا کرنے کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے اور یہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہمارے بچے امین ، راست باز ، بہادر ، جری ، خود اعتماد ، مستقل مزاج اور دوسروں کا خیال رکھنے والے بن سکتے ہیں۔

آغازِ زندگی میں

شیر خواری کے زمانے میں بھی بچے میں خواہشات پائی جاتی ہیں گو یہ خواہشات سیدھی سادی ہوتی ہیں جیسے غذا اور جسمانی راحت کی خواہشات۔ کچھ دن گزرنے کے بعد بچہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس کی تعریف کریں۔

جب ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے تو وہ تکمیل کا سبب اپنی ان خاص حرکتوں کو ان لوگوں کو گردانتا ہے جن کے ذریعے تکمیل ہوتی ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ شیر خوار بچہ بتدریج یہ معلوم کر لیتا ہے (اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ شعوری طور پر معلوم کر لیتا ہے) کہ اس کا ایک خاص طرزِ عمل اس کے لیے مسرت بخش ہے۔

اس طرح (یہاں بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ شعوری طور پر ایسا کرتا ہے) وہ آگے چل کر اس طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے جو زمانۂ ماضی میں اس کے لیے اطمینان اور مسرت کا باعث تھا۔ یعنی وہ اس طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے جو اس کے تجربے میں مسرت بخش ثابت ہوا ہے۔ یہ واضح رہے کہ زمانۂ شیر خواری کے یہ تجربات اپنے اندر بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بچے کی اس نشو و نما کو ظاہر کرتے ہیں جو آگے چل کر ہوتی ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ابتدا میں دو چھوٹے بچوں میں زیادہ فرق نہ پایا جائے بلکہ بادی النظر میں ان دونوں کی طبیعتوں میں کوئی اختلاف ہی نظر نہ آئے لیکن ابتدائی زندگی کے جزوی فرق کے ساتھ تجربات کی بنا پر وہ جُدا جُدا روِش اختیار کرتے ہیں۔ ان کا حال ایسے دو مسافروں کا ہے جو دو راستوں پر ایک دوسرے سے جُدا ہوں اور جن کے درمیان ایک گز سے بھی زیادہ فاصلہ نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے سے

جُدا نہ ہوئے ہوں بلکہ صرف ان کا رُخ علیحدہ راستوں پر ہو لیکن ان کا یہ رُخ کرنا ہی کافی ہے۔ وہ آگے قدم بڑھاتے ہیں تو ان کے راستے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ پھر جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے ہیں وہ ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک بچّے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جب وہ روتا ہے تو اس کو گود میں اُٹھا لیا جاتا ہے اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی ہے لیکن ایک دوسرا لڑکا روتا ہے تو (بشرطیکہ اسے کوئی تکلیف یا بیماری نہیں ہے) اسے اپنے حال ہی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پہلی صورت میں رونا موجبِ تسلی ہوتا ہے لیکن دوسری صورت میں رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اس لیے رونا موجبِ تسلی نہیں ہوتا۔ یہ عام مشاہدہ ہے کہ دوسرے لڑکے کی نسبت پہلا لڑکا رونے کی طرف زیادہ مایل ہوگا اور خواہ مخواہ اور بے ضرورت بھی مُنہ بسورتا رہے گا۔

ہم جس امر پر زور دے رہے ہیں وہ محض یہ نہیں ہے کہ پہلا لڑکا دوسرے لڑکے کے مقابلے میں زیادہ رونے والا ہوگا۔ اگر یہ معاملہ یہیں ختم ہو جاتا تو کوئی ایسی زیادہ ہرج کی بات نہ تھی۔ لیکن بڑی بات تو یہ ہے کہ اس ابتدائی زندگی کے علیحدہ علیحدہ تجربات کی وجہ سے ان کی نشو و نما کے دو علیحدہ علیحدہ راستے ہو گئے ہیں۔

دوسرا لڑکا ذرا بڑا ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ماں باپ رونے پر اس کی تشفی نہیں کرتے اور رونا بے فائدہ ہے اور جلد غیر شعوری طور پر تجربہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہنس کر اور کلکاریاں مار کر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے اور اچھی اچھی چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

اس طرح ایک لڑکے کی نشو و نما اس ذہنیت کے ساتھ ہوتی ہے کہ رونے سے کام بنتے ہیں۔ برعکس اس کے دوسرے لڑکے کی نشو و نما اس ذہنیت کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہنسی خوشی سے کام بنتے ہیں۔ اب ان کی راہیں ایک نہیں ہیں بلکہ جدا جدا

ہوگئی ہیں جس کی وجہ سے آگے چل کران میں جدا جدا کردار کی نشو و نما ہوتی ہے۔ وہ اور بڑے ہوتے ہیں۔

پہلے بچے کو یہ معلوم ہے کہ زندگی میں بغیر روئے (اب اس کو حقیقی معنی میں سمجھو یا مجازی معنی میں) کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلبلانا، لجاجت کرنا اور گڑگڑانا رونے ہی میں داخل ہے۔ ایسا بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو ان لوگوں کی مانند ہوتا ہے جو ہمیشہ زندگی کا شکوہ کرتے ہیں، ہمیشہ کسی نہ کسی کی ہمدردی کے طلبگار رہتے ہیں ہمیشہ اپنی بیماری کا راگ الاپتے اور اس سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، ہمیشہ اپنے آپ پر ترس کھاتے ہیں؛ بہرحال یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے اور ایسے لوگوں سے دنیا بھی واقف ہے۔

یا اگر بچہ طبیعت کے چڑچڑے پن سے روتا ہے تو پھر بڑا ہوکر چڑچڑا، تنک مزاج، متلوّن، زودرنج، غصیل اور آتش مزاج نکلتا ہے۔

لیکن دوسرا بچہ خوشی اور خوش مزاجی کے ساتھ رہ کر اپنے کام نکال لیتا ہے اور اس کو زندگی میں کوئی بات ناگواری کی نہیں معلوم ہوتی، اس کی نشو و نما اسی ذہنیت کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کی تمام زندگی ہنسی خوشی کے ساتھ گزرتی ہے۔ وہ خوش مزاج، خوش اخلاق اور اچھا آدمی نکلتا ہے۔

ایک تیسرا بچہ ہے اسے بھی رونے پر منایا نہیں جاتا لیکن یہ بچہ جیسی کچھ زندگی ہوتی ہے قبول کرلیتا ہے۔ اس کی نشو و نما اسی ذہنیت کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ بڑا ہوکر ممکن ہے اپنی زندگی پر قانع نہ ہو مگر بُری بھلی جیسی کچھ ہے گزار لے۔

ایک چوتھا لڑکا ہے جسے یہ تجربہ ہوا ہے کہ اطاعت، فرماں برداری اور مسکینی کے ساتھ جو کچھ خواہش ہے پوری کی جاسکتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے والدین کی منت خوشامد کرتا ہے جو چاہتے ہیں کہ وہ مطیع و منقاد رہے۔ ممکن ہے وہ اس بات کو پسند نہ کریں کہ وہ

بڑا ہو کر خوشامدی ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات ان کے ذہن ہی میں نہ آئے لیکن اپنے اس طرزِ عمل سے وہ بچے کے یہ ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ فائدہ بھلمنساہت اور اطاعت کے ساتھ رہنے ہی میں ہے۔ اس طرح بچے کی نشوونما اسی ذہنیت کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ بڑا ہو کر طبیعت کا نرم، غریب اور فرماں بردار ہوتا ہے اور شاید خوشامد اور چاپلوسی بھی اس کے مزاج میں رہے۔

ایک دوسرا لڑکا تجربے سے معلوم کرتا ہے کہ اس کے والدین امن وعافیت کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ غیظ وغضب، خودمختاری اور تندمزاجی کے ساتھ اپنی خواہش کی تکمیل کرتا ہے۔

اوپر بیان کی ہوئی ایک ایک مثال کے لیے تم اپنے شناساؤں میں سے ایک ایک آدمی کو لو اور غور کرو کہ کیوں کر ان کا موجودہ کردار ان کی بچپن کی خاص تربیت کا نتیجہ ہے۔

مختلف راستوں پر

عقلمند والدین اپنے بچے کی حوصلہ افزائی کرتے اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ دنیا کے نیک وبد پر آپ غور کرے، آپ اپنا کام کرے، آپ اپنے ہاتھ سے کھائے، آپ کپڑے پہنے اور آپ اپنے کھیل کھیلے۔ اس طرح بچے کے کردار میں بتدریج خوش اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مشکلات کو جھیلنے کا خوگر ہو جاتا ہے۔ ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے نہیں گھبراتا اور اپنی ذاتی رائے پر بھروسا اور اس پر عمل کرتا ہے۔

برخلاف اس کے ایک دوسرا لڑکا ہے جو بے وقوف ماں باپ یا بڑے بھائی یا بڑی بہن کا بہت لاڈلا ہے جو بچے کو اپنے حال پر نہیں چھوڑتی بلکہ اس کے ساتھ لگی رہتی ہے اور اس کی زندگی میں خود بہت بڑا حصہ لینا پسند کرتی ہے اور یہ چاہتی

ہے کہ اس کو وہی کھانا کھلائے، وہی اس کے ساتھ کھیلے اور وہی اس کا دل بہلائے
حالانکہ بچے کی بھلائی تو اس میں ہے کہ وہ اپنی مشکلات کا آپ مقابلہ کرے اور خود سوچے
اور خود ہاتھ پاؤں ہلائے اور خود اپنی ذاتی رائے رکھے۔ ایسا بچہ بڑا ہو کر جیسا کچھ
ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ ایسا آدمی خود کسی کام کی ابتدا نہیں کرتا۔ اس میں خود اعتمادی
نہیں ہوتی اور کسی نہ کسی شخص کا سہارا ڈھونڈتا ہے، ذمہ داری سے بھاگتا ہے اور کوئی
ذمہ دارانہ کام عمر بھر انجام نہیں دے سکتا۔

اکثر لوگوں نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ قوی دماغ ماں باپ خصوصاً مستقل اور مستحکم
رائے رکھنے والے باپ کے بچے خود کوئی دماغ نہیں رکھتے اور بہت کم زور طبیعت
کے نکلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مستقل اور مستحکم رائے رکھنے والے
باپ نفسیات سے عدم واقفیت کی وجہ سے اکثر اوقات اپنی رائے اور اپنے
خیالات کا پابند خواہ مخواہ اپنے بچوں کو بھی بناتے ہیں اور بچے کی خود سوچنے اور غور
کرنے کی ابتدائی کوششوں پر لاطایل دلایل سے اور بعض اوقات تمسخر اڑا کر پانی پھیر
دیتے ہیں جس کا مایوس کن انجام یہ ہوتا ہے کہ قوی دماغ والدین کی اولاد قوی دماغ
نکلنے کی بجائے جس کی عام طور پر توقع ہوتی ہے کوئی دماغ ہی نہیں رکھتی اور ان میں یہ
صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ خود سوچیں اور اپنی ذاتی رائے بھی رکھیں۔ والدین کو چاہیے
کہ بچے کی ذاتی رائے قائم کرنے کی ابتدائی کوششوں میں (گو یہ کوششیں کیسی ہی بے
معنی ہوں) بہت سنبھل کر دخل دیں۔

چڑچڑے اور "جھٹ خفا" والدین کے بچے تجربے سے جلد معلوم کر لیتے ہیں
کہ ان کے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ خاموش اور حتی الامکان نظروں سے اوجھل رہیں
تاکہ توجہ ان پر منعطف نہ ہو۔ ان کے لیے اپنے والدین کی نظروں میں پڑ جانا ہی
ناگواریٔ خاطر کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح بتدریج ان میں یہ عادت طبیعتِ ثانی بن جاتی ہے

کہ اپنی طرف کسی کی توجہ منعطف نہ ہونے دیں اور نظروں سے دُور رہیں۔ جب کبھی وہ دیکھتے ہیں کہ نظریں ان پر پڑ رہی ہیں تو پریشان، خوف زدہ اور بوکھلائے ہوئے سے رہتے ہیں۔ اسی طرح شرمیلے اور جھینپو آدمی وہ ہوتے ہیں جو بچپن میں اپنے بزرگوں کی زجر د توبیخ کا ہمیشہ نشانہ رہے ہیں اور جن کی شخصیت کو مل دل کر رکھ دیا گیا ہے۔

ایک اور عام مشاہدہ لیجیے۔ ایک بچّہ معلوم کر لیتا ہے کہ ڈینگ مارنے اور اکڑفوں کرنے ہی سے کام بنتے ہیں اس لیے وہ ہمیشہ اپنی طرف لوگوں کی توجہ منعطف کرنے اور اپنے آپ کو سراہنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور بچے پر جان دینے والے ماں باپ اور احمق ملاقاتی اس کے سامنے اس کی تعریف کرتے ہیں" ہاں ذرا ننھے کو دیکھنا۔ کیا ہی چالاک ہے۔ کل ہی کا واقعہ ہے کہ اس نے ...."

اس طرح ننھا بڑا ہو کر کیا ہوتا ہے؟ جو کچھ وہ ہوتا ہے آپ ہم سب جانتے ہیں!

تجربات سے کردار کی تعمیر

اوپر محض چند اشارات بیان کیے گئے ہیں جن سے قارئین خود عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔

ہمیں تسلسل نشو و نما کے اصول کو اوّلاً جاننا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک فرد بلکہ قوم اور سوسائٹی کے متعلق بحث کرنے میں" اس کے موجودہ زمانے کو سمجھنے کے لیے اس کے ماضی سے واقف ہونا ضروری ہے" ایک آدمی اب جو کچھ ہے وہ اپنی موروثی جبلّی بنیادی خواہش کی وجہ سے ہے۔

نیز ان واقعات ، تجربات اور دوسرے لوگوں کا اس کے ساتھ سلوک اور ان کے اثر کی وجہ سے ہے جو شیر خواری کے زمانے سے اس پر مترتب ہوتا ہے۔

ہمیں اس اصول کو بھی جاننا ضروری ہے کہ ایک خاص قسم کی عادت طبیعت ثانی اور شخصی کردار کی نشو و نما اس چیز پر منحصر ہے جس کی وجہ سے کسی شخص کو اس کے تجرباتِ زندگی میں زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔ جب ایک بار عادت پڑ گئی اور کردار بن چکا تو پھر وہ شخص اپنی عادت اور کردار کے مطابق سوچتا، احساس رکھتا اور کام کرتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس گوں کا آدمی ہو گیا ہے۔ والدین اور اساتذہ کو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کیوں کر ایک خاص کردار کی نشو و نما ہوتی ہے۔

آخر میں کسی غلط فہمی کے احتمال کو رفع کرنے کے لیے ہم یہاں مکرر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ہماری حجت نہیں ہے کہ کردار ابتدائی بچپن میں قائم ہو جاتا ہے بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ابتدائی بچپن کے تجربات آیندہ نشو و نما کا رُخ بتاتے ہیں۔

ہمارے قارئین کے لیے یہ ایک مفید مشق ہوگی کہ وہ ان ممکنہ نتائج پر بھی غور کریں جو ان حالات کی تبدیلی سے رونما ہو سکتے ہیں جن میں بچّے کا موجودہ کردار بن رہا ہے۔ فرض کرو کہ پہلے دو سال تک بچّے کو اس کی طبیعت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور جب بچّے کا کردار ایک خاص قسم سے بننا شروع ہوتا ہے تو حالات یکایک بدل جاتے ہیں اور اس پر روک ٹوک شروع ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں کس نتیجے کی توقع ہو سکتی ہے۔ یا اس کے برخلاف فرض کرو۔ یا فرض کرو کہ ابتدائی سالوں میں بچّے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنی طرف توجہ منعطف کرائے اور اپنے

آپ کو دکھائے۔ مگر اس کے بعد حالات میں تبدیلی ہوتی ہے اور اگر بچہ توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانا چاہتا یا اپنی قابلیت دکھانا چاہتا ہے تو اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے یا کوئی اس کو نہیں پوچھتا۔ غور کرو کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ یا پھر ایک دوسرا بچہ پیدا ہونے پر بڑے بچے پر اس کا کیا اثر مترتب ہوتا ہے۔ یا اکلوتے بچوں میں اور ان بچوں میں جن کے بھائی بہن زیادہ ہوتے ہیں ہم کیا فرق دیکھتے ہیں اور پھر سب سے بڑے بچے اور سب سے چھوٹے بچے میں ہمیں کن کن باتوں میں اختلاف کی توقع ہو سکتی ہے۔ یہ مسائل اس قابل ہیں کہ ان کی چھان بین کی جائے۔ ہر مثال میں ہم اسی ایک نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہماری زندگی کے گزشتہ تجربات میں جس چیز سے ہمیں مسرت اور فائدہ حاصل ہوا ہے اسی کے لحاظ سے ہمارا شخصی کردار بنتا ہے۔ اور جب ایک بار عادات اور شخصی کردار قائم ہو چکا تو پھر بچہ یا بڑا اسی طریقے پر رہتا ہے۔

یہاں ہم پھر فرض کرتے ہیں کہ ایک بچہ دن کا کچھ حصّہ اپنے گھر میں گزارتا ہے جہاں کا ماحول اس میں ایک خاص قسم کا کردار پیدا کر رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کچھ حصّہ دن کا مدرسے میں گزارتا ہے جہاں کا ماحول ایسا ہے جس سے اس میں مختلف قسم کے کردار کی نشو و نما ہو رہی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ یہ کردار بالکل متضاد ہوں۔ ایسی صورت میں بچہ بڑا ہونے کے بعد متضاد کردار کا حامل ہوگا اور یہ مثال شاذ نہیں ہے کیوں کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ تجربہ کم و بیش ہم سب کو ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر صورتوں میں ہمارا کردار یکساں نہیں ہوتا اور ہماری اندرونی قوتیں آپس میں شیر و شکر نہیں ہوتیں۔ تقریباً ہم سب متضاد اور باہمدیگر ناموافق اوصاف کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کی ایک شخصیت نہیں ہوتی بلکہ متضاد شخصیتوں کا مرکب ہوتے ہیں۔ کبھی ایک شخصیت ہم پر غالب ہوتی ہے تو کبھی دوسری شخصیت۔

ہمارے ابتدائی خیالات

اب ہم ایک دوسری قسم کا تجربہ بیان کرتے ہیں جس کے نتائج بہت دُور رس ہو سکتے ہیں۔

ہم والدین اور استادوں کو اکثر یہ کہتے سنتے ہیں "کیسا شریر بچہ ہے کیسا خراب بچہ ہے" اکثر صورتوں میں اس گفتگو کا بچے پر کوئی اثر مترتب نہ ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سو بچوں میں چند بچے ضرور اس خیال سے متاثر ہوتے ہیں جو ان کے دماغ میں جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو یہ خیال بھی اس کے دماغ میں جاگزیں رہتا ہے کہ وہ شریر اور خراب بچہ ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ دوسرے حالات کے تابع ہوتا ہے۔ اگر بچہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ وہ واقعی خراب ہے تو پھر وہ نادانستہ طور پر اسی معیار کے مطابق رہنے پر مجبور ہو گا۔ ابتدائی بچپن میں جب یہ اس کے ذہن نشین ہو جائے کہ وہ "بدمعاش" ہے تو واقعی وہ "بدمعاش" نکلے گا۔ یہ محض قیاس آرائی یا تصور نہیں ہے۔ بیشتر حالات میں جن کی تحقیقات نفسیات دانوں نے کی ہے اس حقیقت کا پتہ چلا ہے کہ بُرے اوصاف کی قطعی طور پر ابتدا اسی خیال کا اثر ہے۔ مختلف حالات میں یہ خیال مختلف طریقوں سے اپنا اثر کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرے اثرات کی بنا پر بچے میں قوی اخلاقی کردار کی نشوونما ہو۔ اس صورت میں بچہ بڑا ہو کر اچھا نکلے گا اور اچھے طریقے سے زندگی گزارے گا اور شاید اخلاقی ضابطے کی بہت سختی کے ساتھ پابندی کرے۔ لیکن اپنی تمام عمر وہ اس خیال کو کبھی دور نہ کر سکے گا جو بچپن میں اس کے دماغ میں جاگزیں ہوا ہے اور باوجود عملی حیثیت سے نیک اور اچھے ہونے کے وہ اپنے متعلق یہی سمجھے گا کہ در اصل وہ نالایق، زشت خو اور بد آدمی ہے۔ بڑے ہونے

کے بعد اکثر اوقات یہ خیال مذہبی عقائد میں گھل مل جاتا ہے اور ایسا شخص اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتا ہے لیکن یہ خیال فقط اسی ایک طریقے سے ظاہر نہیں ہوتا۔

ایک دوسرا خیال جو بچے کے دماغ میں بار بار کہہ کر ذہن نشین کرایا جاتا ہے یہ ہے "ارے ننھے تو کیسا ڈرپوک ہے، بہت تیری بزدلی کی" اگر یہ الفاظ بچے سے بار بار کہے جائیں اور پُر اثر طریقے سے ان کو دہرایا جائے اور ان کے اثر کو زائل کرنے کے لیے دوسرے حالات حائل نہ ہوں تو یہ الفاظ چھوٹے بچے کے دماغ میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ جب یہ بچہ بڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرنے سے ہچکچاتا ہے۔ اپنے فیصلے پر اس کو اعتماد نہیں ہوتا۔ خود اعتمادی اس میں نام کو نہیں ہوتی اور ہمیشہ ذہنی پستی کا شکار رہتا ہے۔ غرض اس کی تمام عمر اس طرح گزرتی ہے۔

دوسری طرف غالباً یہ بھی عقلمندی نہیں ہے کہ بچپن کے ابتدائی دور میں بچے کو اس قسم کے خیالات سے بالکل ناآشنا رکھا جائے۔ یہ ایک دوسری قسم کی حماقت ہوگی۔ بچے کی تربیت میں مقصد یہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ کبھی وہ اپنے آپ کو عقل مند سمجھے اور کبھی بے وقوف اور اس کو یہ معلوم کرانا چاہیے کہ آگے چل کر اس کے عقل مند یا بے وقوف نکلنے کا دارومدار خود اس پر ہے۔

آخر میں ایک قسم خود پسند آدمی کی بھی ہے جس کو ہم روزانہ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں جو بچپن میں اپنے چاہنے والے والدین کے منہ سے یہی سنتا آیا کہ "کیسا اچھا بچہ ہے۔ تم بہت اچھے بچے ہو۔ کیسے پیارے بچے ہو۔ دنیا میں تم سے بہتر کوئی بچہ نہیں" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ننھا شیطان یہ باور کرنے لگتا ہے کہ حقیقت میں وہ ویسا ہی ہے اور اپنی تمام عمر اسی نشے میں سرشار رہتا ہے۔

کیا تم ایسے کسی آدمی کو پہچانتے ہو؟

یکساں حالات

اس مضمون پر اتنا کچھ لکھنے کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "فرض کرو کہ دو بچے ایک ہی گھر میں ایک ہی والدین کے زیر سایہ اور بالکل ایک ہی طریقے سے پرورش پاتے ہیں۔ اب کیا ان دونوں بچوں کے اخلاق و عادات ایک ہی قسم کے ہوں گے؟"

ہمارا جواب یہ ہے کہ دونوں بچوں کے لیے ایک ہی نوعیت کے حالات قائم نہیں رہ سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی دو بچے بالکل ایک ہی قسم کے حالات میں پرورش پائیں اور انھیں اپنی زندگی میں ایک ہی قسم کے تجربات سے سابقہ پڑے اور تسلسل میں بھی کوئی فرق نہ ہو۔ پہلے تو یہ کہ والدین کی طبیعتیں بدل جاتی ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل ایک ہی قسم کا رہے۔ پہلے بچے کی تربیت میں جو تجربہ انھیں حاصل ہوتا ہے اس میں دوسرے بچے کی تربیت کے وقت کچھ اصلاح ضرور ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ والدین کے حالات بھی بدل جائیں۔ ان کی صحت پہلی سی نہ ہو۔ ان کے آپس میں تعلقات بھی پہلے سے نہ ہوں۔ ان کی عمر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس اثنا میں سینکڑوں واقعات ایسے پیش آتے ہیں جن کی وجہ سے اپنے بچوں کے ساتھ ان کے رکھ رکھاؤ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور ہوتی ہے اور بچوں کے سامنے آپس کے طرزِ عمل میں بھی فرق ہونا ضروری ہے۔

پھر ان دونوں بچوں میں یہ بہت بڑا فرق ہوتا ہے کہ ایک بڑا ہے تو دوسرا چھوٹا۔ چھوٹے کے ماحول میں یا بڑا بھائی یا ایک بڑی بہن ہوتی ہے تو بڑے کے ماحول میں ایک چھوٹی بہن یا ایک چھوٹا بھائی ہوتا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھ کر فرق دونوں کے ماحول میں ہو سکتا ہے؟

مزید یہ کہ دونوں بچوں کے ساتھ کھیلنے والے بچے ایک طبیعت کے نہیں ہو سکتے اور اگر ایک طبیعت کے بھی ہوئے تو ان کے ساتھ دونوں بچوں کے تعلقات ایک نہیں ہو سکتے۔ ان دو بچوں کے طبعی حالات میں بھی جو ایک عمر کے نہیں ہیں، فرق ہونا ضروری ہے۔ ممکن ہے ایک موسم گرما میں پیدا ہوا ہو اور دوسرا موسم سرما میں۔ اس کے ساتھ ان کے "طبعی حالات" میں بھی فرق ہونا ضروری ہے۔

ہم جس بات پر زور دے رہے ہیں اور جسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں وہ یہ ہے کہ معمولی سی معمولی چیز کا بھی زندگی کے دورِ اولیں میں بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ کچھ دن بعد ان کا اتنا زیادہ اثر نہیں ہوتا کیوں کہ اس عرصے میں خاص طبیعت یا کردار کی تشکیل ہو جاتی ہے لیکن بچپن کی بالکل ابتدائی زندگی میں جب کہ عادتیں بننے نہیں پاتیں حالات میں خفیف سا خفیف اختلاف بھی آگے چل کر بہت دور رس نتائج کا باعث ہوتا ہے۔

اگر ان کی ابتدائی زندگی کے حالات و تجربات میں کوئی فرق ہو تو یہ حقیقت توام بچوں پر بھی صادق آتی ہے لیکن توام بچوں کی صورت میں زیادہ تر دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے مشابہ ہیں یا نہیں۔ جس قدر وہ جسمانی حالت، صحت اور صورت شکل میں مشابہ ہوں گے اسی قدر ان کی پرداخت و تربیت ایک نمونے پر ہوگی اور بچپن میں ایک ہی قسم کے تجربات سے انھیں سابقہ پڑے گا۔

آخر میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابتدائی اسباب کے علاوہ کسی دو بچوں میں پیدائش ہی سے کچھ نہ کچھ طبعی اختلافات کا ہونا ممکن ہے۔ انسانی زندگی کا آغاز اس کی پیدائش کے وقت سے نہیں ہوتا بلکہ ہم کو جنین کے ماحول اور اس کی غذا

کے اختلافات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جس کی وجہ سے نطفہ نو ماہ میں سات یا دس پونڈ کے بچے میں مبدّل ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ محض تولیدی رجحانات میں بعض جسمانی اوصاف اور بعض کورانہ جبلتوں کی نشو و نما ہوتی ہے لیکن ان میں بھی خصوصاً جسمانی اوصاف میں جنینی زندگی اور غذا کے مختلف حالات سے بہت کچھ اختلاف ممکن ہے لیکن دراصل انحصار اپنی اپنی زندگی کے حالات و تجربات پر ہے جو شیر خواری کے زمانے سے پیش آتے ہیں۔

کوئی چیز کس قدر موروثی ہے؟

باپ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ذہانت موروثی ہے لیکن بیٹا بڑا ہو کر بے وقوف نکلتا ہے۔ اُس وقت وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ذہانت موروثی نہیں ہے۔

جدید نفسیات کا تمام تر رجحان اس قدیم غیر سائنٹفک خیال سے بالکل ہٹ کر ہے جو ذاتی کردار کو جبلّی قرار دیتا ہے۔ پروفیسر ولیم جیمس کے قول کے مطابق کسی شخص کے سو میں سے ننانوے طریقہ ہائے عمل (جن میں تخیل اور جذبات بھی شامل ہیں) کا انحصار محض عادت پر ہے۔ بالفاظِ دیگر ہمارے محسوس کرنے، سوچنے اور طرزِ عمل کے جو خاص طریقے ہیں وہ ہمارے زمانۂ ماضی کے تجربات پر مبنی ہیں۔" اس طرح عادت طبیعتِ ثانی ہے یا جیساکہ ولنگٹن کا قول ہے عادت فطرت سے دس گنی زبردست ہے اور جوان آدمی کی زندگی میں عادت کی اہمیت ایک مسلمہ امر ہے کیوں کہ تربیت کی بدولت جو کچھ عادتیں ہم میں پیدا ہوتی ہیں وہ اس وقت تک راسخ ہو جاتی ہیں اور بہتیرے فطری جذبات کا گلا گھونٹ دیتی

ہیں جو ابتداءً ہم میں موجود تھے"۔ جیمس کے اس قول کے بعد نفسیات دانوں نے اس کے اس قول کی تائید میں بہت کچھ ثبوت فراہم کیا ہے۔

اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی چیز موروثی یا خلقی نہیں ہے۔ پروفیسر ہکسلے کہتے ہیں "کسی جسم کی چگونگی یا خاصیت نہ تو بالکل وراثت ہی کے تحت ہے اور نہ بالکل ماحول ہی کے .... موروثی نظام ہمارے امکانات کی حدبندی کرتا ہے اور ماحول یہ تصفیہ کرتا ہے کہ ان امکانات کے منجملہ کن امکانات پر ہم قابو حاصل کریں گے۔ اس طرح موروثی نظام ایک خاص ماحول میں ایک خاص طریقے سے ردعمل کی قابلیت کا نام ہے"۔ پروفیسر ایچ ایس جننگس کہتے ہیں "ہر ذی روح میں بہت کچھ ورثۃً پایا جاتا ہے لیکن اب اس ورثے میں کون سی چیز اُبھرے گی، اس کا انحصار نشو و نما کے حالات پر ہے۔ صحیح تر یوں کہیے کہ جو کچھ والدین نے وراثۃً چھوڑا ہے وہ چند کیمیاوی اجزا کے پیکیٹ ہیں، جو ایک قسم کے حالات میں ایک قسم کے اوصاف اور دوسری قسم کے حالات میں دوسری قسم کے اوصاف پیدا کرتے ہیں"۔

اس طرح ایک بچے میں جسمانی طور پر ایک درجن یا درجن سے زاید طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر نشو و نما پانے کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور جس طریقے سے نشو و نما ہوگی اس کا دار و مدار اس کے ارد گرد کے حالات اور تجربات پر ہے۔ اب جو کچھ بھی جسمانی ساخت نتیجۃً ہوگی اس ساخت پر سینکڑوں یا ہزاروں قسم کے کردار اور دماغ پھلتے پھولتے ہیں اور بشرطیکہ کوئی خاص نسلی کمزوری نہ ہو عملی حیثیت سے ہم کسی شخص کے دماغی، اخلاقی اور طبیعی اوصاف کو اس کے ارد گرد کے حالات، دوسرے لوگوں کے اثرات اور اس کے ساتھ ان کے سلوک اور اس کی اپنی زندگی کے تجربات کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔

لمبی ناک اور لال بال موروثی ہو سکتے ہیں لیکن جسمانی خواص کی موروثیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دماغی اور اخلاقی خواص بھی موروثی ہیں۔ صداقت، بد دیانتی، استقلال یا زشت کلامی موروثی نہیں ہیں۔

اکثر صورتوں میں والدین اور بچوں کے کردار اور خیالات میں مماثلت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سخت غلطی ہے کہ یہ اوصاف موروثی ہیں۔ ممکن ہے مماثلت کی یہ وجہ ہو کہ والدین اور بچوں کی تربیت ایک ہی حالات اور ایک ہی ماحول میں ہوئی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے بچے جو نہایت پست اخلاق اور کمزور اور ضعیف البنیان ہوتے ہیں اوسطاً ان بچوں سے بہت گھٹے ہوئے ہوتے ہیں جن کے والدین کی معاشی حالت اچھی ہوتی ہے اور جو اپنے بچوں کو صحت و قوت بخش ماحول میں پرورش کر سکتے ہیں لیکن صرف اسی ایک چیز سے نسلی اور موروثی پستی ثابت نہیں کی جا سکتی گو بلا شک و شبہ اکثر صورتوں میں حقیقۃً کچھ نہ کچھ جسمانی نقص ضرور موروثی ہوتا ہے۔

جو لوگ پیدائشی طور پر کمزور اور کچھ نہ کچھ جسمانی نقص رکھتے ہیں ان کے لیے بہتری تو اسی میں ہے کہ انھیں دنیا میں آنے نہ دیا جائے یا کم از کم اپنی اس مصیبت کو اپنی نسل پر منتقل کرنے سے انھیں روکا جائے۔

جبلّتیں مستحکم یا ضعیف کی جا سکتی ہیں

یہ صحیح ہے کہ انسانی فطرت کی تہ میں چند خاص خواہشیں اور جبلی جذبات پائے جاتے ہیں جو کم و بیش تمام انسانوں میں مشترک ہیں جیسے غذا، پانی، گرمی، سونے، آرام حاصل کرنے سستانے اور زاید حرارتِ غریزی کو خارج کرنے وغیرہ کی خواہشیں بعض کورانہ جبلّتیں اور مخصوص جذبات بھی ان خواہشات کے ساتھ شامل ہیں جیسے اچانک گھبرا جانے

کی صورت میں گم صم اور اپنی جگہ بہوت ہو جانے کی جبلت ، خوف کے مارے فرار ہو جانے کی جبلت ، حملہ کرنے کی جبلت ، تعشق اور جوڑے کے ساتھ رہنے کی جبلت ، ہمدردی ، تقلید ، تحقیق اور اپنا سکہ جمانے کی جبلتیں ۔ یہ تمام جبلتیں خلقی ہیں یا یہ کہیے کہ ان کی نشو و نما کا رجحان خلقی ہے ۔ لیکن ایک شخص میں ان خواہشات اور جبلی جذبات کی قوت اور ان کی دراصل نشو و نما کا زیادہ تر دارومدار اس کی غذا ، اس کے ماحول اور اس کے تجربات پر ہے ۔

یہ اصول تمام جسمانی خواہشات اور جبلی جذبات سے متعلق ہے جو محض خلقی نہیں ہیں اور نہ محض ماحول اور تجربے کا نتیجہ ہیں ۔ مثال کے طور پر ڈر ہی کو لیجیے ہر شخص میں خلقی طور پر یہ رجحان موجود ہے کہ خاص حالات میں ڈرے لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ ابتدائی پانچ چھ سال میں بچے کے خوف کو تقلید اور تجربے سے بڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا تو ایسے بچے میں ڈر کی جو فطرت ودیعت ہوئی ہے وہ زیادہ مستحکم نہ ہونے پائے گی لیکن برعکس اس کے فرض کرو کہ ڈرپوک اور کم زور ماں کو چھوٹا بچہ دیکھتا ہے یا فرض کرو کہ بچے کو رام کرنے کے لیے بے وقوف ماں اس کو کسی چیز سے ڈراتی ہے تو اس تقلید اور تجربے کی بنا پر بچے کی فطرت میں عمر بھر خوف غالب رہے گا ۔ ہم پھر کہتے ہیں کہ جسمانی خواہشات اور جبلی جذبات کی نشو و نما کا رجحان خلقی ہے لیکن حقیقت میں جس پیمانے پر ان کی نشو و نما ہوتی ہے اس کا تمام تر انحصار اپنی اپنی زندگی کے تجربات اور واقعات پر ہے اور اس امر پر موقوف ہے کہ بچپن میں کس قدر ان کو بڑھنے اور ابھرنے کا موقع دیا گیا ۔

ایک بچہ پہلی مرتبہ روتا ہے ۔ اس کو گود میں اٹھا لیا جاتا ہے اور اس کی تسلی کی جاتی ہے ۔ یہ اس کے حق میں رونے کا خوش گوار نتیجہ نکلا ۔ اب اس میں دوبارہ منہ بسورنے کا رجحان پہلے سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے ۔ ایک شیر خوار پہلی مرتبہ اپنی

بدمزاجی ظاہر کرتا ہے اور جس چیز کے لیے وہ بدمزاج ہوا تھا وہ اس کو دے دی جاتی ہے۔ یہ بدمزاجی کا خوش گوار نتیجہ نکلا۔ اس طرح بدمزاجی کا خلقی میلان جو بچے کی فطرت میں ہے تقویت حاصل کرتا ہے۔ اب بچے میں بدمزاجی کی نشو و نما ہوتی ہے اور جیسے جیسے یہ عادت مستحکم ہوتی ہے خلقی رجحان میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

جسمانی خواہشات اور جبلی جذبات فطرتِ انسانی کی زبردست قوتیں ہیں جو ہزارہا مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو ظاہر کرسکتی ہیں اور جس طریقے سے یہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں وہی دراصل اہمیت کی چیز ہے اور یہی وہ طریقے ہیں جنھیں عادت مستحکم کرتی ہے۔ اس طرح عادت آدمی کے دماغ اور کردار کا تانا بانا ہے۔

بچپن سے گزرنے کے بعد عادتیں اس قدر راسخ ہو جاتی ہیں اور ہمارے خیالات، احساسات اور طرزِ عمل کا سانچا ایسا قائم ہو جاتا ہے کہ نئی عادت کی طرف جو میلان ہوتا ہے وہ قدیم عادتوں کے شکنجے میں پھنس کر تہس نہس ہو جاتا ہے، لیکن بہت ہی ابتدائی عمر میں تقریباً خفیف سا خفیف اور جزئی سا جزئی امر بھی عادت کی تشکیل کے لیے کافی ہے۔

عادت

جب تم سویرے کپڑے پہنتے ہو تو عادتاً کون سا پاتابہ یا موزہ پہلے پہنتے ہو۔ سیدھے پانو کا یا دائیں پانو کا۔ پائجامہ پہنتے وقت کس پانو میں پہلے پہنتے ہو۔ اسی طرح بوٹ یا شوز کس پانو میں پہلے پہنتے ہو؟

جوان ہونے سے بہت پہلے ہی تقریباً ہر آدمی میں لباس پہننے کی مقررہ عادتیں قائم ہو جاتی ہیں اور ہمارے جسم کو خود لباس پہننے کی مشق ہو جاتی ہے۔

اس طرح ایک خاص طریقے سے ہمارے نظامِ عصبی کو عادت ہو جاتی ہے اور ہم اپنی اسی عادت کے مطابق لباس پہنتے ہیں لیکن ہم کو لباس پہنتے وقت یہ خیال مطلق نہیں ہوتا کہ ہم کس طریقے سے لباس پہن رہے ہیں کیوں کہ اس کام کی جزئیات کو ہم بہت پہلے بھول چکے ہیں اور اب یہ کام عادت کے تفویض ہو چکا ہے۔

اگر ہم ایک بار کسی خاص طریقے سے کسی کام کو انجام دیتے ہیں اور اگر اس کام کا نتیجہ کسی بنیادی خواہش کی تکمیل یا بالفاظِ دیگر کوئی خوش گوار احساس ہوتا ہے تو اسی قسم کے حالات پیش آنے کی صورت میں ہم پھر بالکل اسی طریقے سے کام کرنے پر مایل ہوں گے۔ اگر ہم پھر اسی طریقے سے کام کرتے ہیں تو تیسرے وقت اسی طریقے سے کام کرنے کا میلان قوی تر ہوگا اور چوتھے وقت اور بھی زیادہ قوی ہو جائے گا۔ بالآخر اس کام کی ہمیں عادت ہو جائے گی جس کے انجام دیتے وقت تقریباً ہمیں کوئی کوشش کرنے یا سوچنے سمجھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ عادت کی ابتدا بس اسی طرح سے ہوتی ہے اور یہ عادت ہی ہر قسم کی تعلیم کی اصل ہے۔

جب ہم پیانو بجانا سیکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک نئی عادت کا اپنے آپ کو خوگر کر رہے ہیں۔ جب ہم چلنا یا بات کرنا سیکھتے ہیں یا جغرافیہ یا زبان لاطینی سیکھتے ہیں یا جب ہم ناگوار فرائض کی انجام دہی سے گریز کرتے ہیں یا دوسروں کا خیال رکھتے ہیں یا ایمان داری یا بے ایمانی سے رہتے ہیں یا ضابطے کی پابندی کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ ہم نئی عادتوں کا اپنے آپ کو خوگر کر رہے ہیں۔

ہماری عادتیں ہی ہمارے کردار ہیں

نوعِ انسانی میں بنیادی خواہشات مشترک ہیں جسمانی اختلافات کی وجہ سے

یہ خواہشات ہر شخص میں ایک معیار پہ نہ ہوں لیکن ہر صحیح مرد و عورت میں
یہ خواہشات پائی جاتی ہیں۔

جب یہ خواہشات مشترک ہیں تو پھر لوگوں کے کردار میں اس قدر
باہمی اختلاف کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی خواہشات کو ہم
سینکڑوں مختلف طریقوں سے ظاہر کرتے اور سینکڑوں مختلف ذریعوں سے
ان کی تکمیل کرتے ہیں۔ ہم نے ابتدائی بچپن کے حالات و تجربات کو
بیان کرتے ہوئے یہ بتا دیا ہے کہ بچے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کس
طرح مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ یہی عمل ایک حد تک تمام عمر قائم
رہتا ہے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ عادتیں قائم ہو جاتی ہیں اس لیے اس میں کسی قدر
تبدیلی ضرور ہوتی ہے۔

جب ہم ایک بار ایک خاص طریقے سے کام کرتے ہیں اور اس
کام سے نتیجۃً ہماری کوئی بنیادی خواہش بھی پوری ہوتی ہے تو اسی قسم کے
حالات رونما ہونے کی صورت میں ہم پھر وہی کام کریں گے۔ جس قدر یہ کام
تکرار کیا جاتا ہے اسی قدر ہمارا میلان بھی مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ اور بالآخر اس
خاص طریقے سے ہم اپنی خواہش کے اظہار و تکمیل کے خوگر
ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب کے سابقہ حصے میں ہم نے کئی مثالوں
سے اسی ایک چیز کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی ایک
چیز پر زیادہ زور دیا ہے۔ کردار کی تعمیر ہوتی ہے تو اسی طریقے
سے ہوتی ہے۔

ہر آدمی میں بارہ بنیادی خواہشات ہوتی ہیں۔ اب ان بارہ بنیادی
خواہشات کو ایک شخص (ہم فرض کرتے ہیں) ساٹھ طریقوں سے ظاہر کرتا اور

انھیں پورا کرتا ہے۔ ایک دوسرے شخص میں بھی یہی بارہ بنیادی خواہشات ہیں لیکن یہ شخص دوسرے ساٹھ طریقوں سے کام لینے کا عادی ہے۔ اب ان دو شخصوں کے کردار میں جو بڑا فرق ہے وہ یہی ہے کہ دونوں مختلف طریقوں سے اپنی خواہشات کو ظاہر اور پورا کرتے ہیں۔

عادتوں کا قیام اور ان کو ترک کرنا

کوئی عادت کسی بنیادی خواہش کی تکمیل کے لیے جگہ حاصل کرتی ہے اور جب یہ بخوبی جڑ پکڑ لیتی ہے تو پھر اس کو خواہش کی بھی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں ہماری فطرت کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ احساس، تخیل اور عمل میں انھیں خاص عادات کے پابند ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ عادت کا ابتدائی منازل میں سدِ باب کرنا بہت آسان ہے۔ مگر اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ کون سی خواہش اس خاص طریقے سے پوری ہو رہی ہے اور جب یہ معلوم ہو جائے تو پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس خاص طریقے سے اس خواہش کی تکمیل نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی ضروری ہے کہ اس خواہش کو کسی دوسرے طریقے سے تکمیل کو پہنچایا جائے اور اس طرح جس عادت کو ہم ترک کرنا چاہتے ہیں اس کو ترک کر کے خود کو ایک دوسری عادت کا خوگر کریں۔

فرض کرو کہ ہم ایک بچے کو دیکھتے ہیں کہ ذرا سی تکلیف پر بھی اس میں رونے اور شکایت کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس عادت کی بجائے اس میں استقلال اور ضبط کی عادت پیدا کریں۔ اس کے لیے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس رونے دھونے اور شکایت کرنے کے ذریعے سے کون سی

بنیادی خواہش پوری کی جا رہی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بچّہ جب روتا ہے تو لوگ اس کی طرف مخاطب ہوتے ہیں اور جب روتا نہیں ہے تو کوئی اس کی طرف مخاطب نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ہمیں آیندہ یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ جب کبھی وہ روئے اس کی طرف مخاطب ہی نہ ہوں اور جب وہ اپنی ننھی مشکلات کو استقلال اور ضبط کے ساتھ برداشت کرے تو ستایش کی نظر سے دیکھیں یا ستایش کریں۔ کچھ عرصے کے بعد اس میں استقلال اور ضبط کی عادت پیدا ہو جائے گی جو بعد میں بغیر ستایش کی نظر یا ستایش کرنے کے خود بخود قائم رہے گی۔

غلط عادت اچھی طرح جڑ پکڑ لے تو بنیادی خواہش کی تکمیل بھی اس کے لیے ضروری نہیں رہتی۔ اس نوبت پر جس چیز سے تکمیل ہوتی ہے اس سے دست برداری ہی کافی نہ ہو گی بلکہ سخت تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آیندہ یہ عادت قطعی طور پر ناگوار اور تکلیف دہ معلوم ہو۔ بالفاظِ دیگر ہم کو اس عادت کی خاطر خواہ بیخ کنی کرنی چاہیے۔

ہم پھر یہاں اس امر کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ گو بچّوں ہی کے متعلق ہم نے خاص طور پر لکھا ہے لیکن عادت پیدا کرنے اور عادت توڑنے کے یہی اصول بڑوں سے بھی متعلق ہیں۔

سمجھ دار آدمیوں کی اصلاح کی صورت میں ہم مذکورۂ بالا عمل کی حد تک اپنے آپ کو محدود نہیں کر سکتے کیوں کہ محض کتّوں یا چوپایوں کی اصلاح کی صورت میں ہمارا یہ عمل جائز ہو سکتا ہے۔ عادت کے قیام یا اس کو ترک کرنے کے لیے ایک صحیح جوان آدمی یا ایک تین سال کے بچّے کا شعوری طور پر تعاون ممکن ہے۔ بالفاظِ دیگر عادت پیدا کرنے یا عادت ترک کرنے کی خواہش کو ہم اچھی طرح سے اس شخص کے

ذہن نشین کر سکتے ہیں۔

دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کے وقت ہمارا مقصد محض یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک مناسب کام انجام دیں بلکہ ہمیں چاہیے کہ ان میں اس کام کی رغبت پیدا کریں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کو یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کیوں کر اس طریقے سے وہ اپنی ایک یا ایک سے زاید بنیادی خواہش کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ جو کچھ ہمارا مطمح نظر ہے اس کے متعلق زیادہ تفصیل سے ان کو سمجھانا شاید مناسب نہ ہو لیکن کسی نہ کسی طریقے سے اس کا انھیں علم ہونا چاہیے۔ اور ہمیں ان میں یہ خواہش یا ارادہ پیدا کرنا چاہیے کہ وہ وہی کام کریں جسے کرنے کی ضرورت ہے یا وہ عادت اختیار کریں جو ہم ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں یا ایسے آدمی ہو جائیں جیسے ہم انھیں بنانا چاہتے ہیں اور ہم ان میں یہ خواہش کسی بنیادی خواہش کی طرف ان کی توجہ منعطف کرا کے (اور اگر ضرورت اس امر کی ہو تو راست طور پر نہ کہہ کر بلکہ حکمتِ عملی کے ساتھ) پیدا کر سکتے ہیں۔

نئی عادتیں باقاعدہ طور پر قائم کرنے کے لیے ولیم جیمس نے بعض کارآمد قواعد رہ نمائی کی غرض سے بیان کیے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) یہ اچھی طرح سے ملحوظ رہے کہ نئے طریقے کی ابتدا جس قدر ممکن ہو قوی اور تصفیہ کن طور سے ہونی چاہیے۔ تمھارے لیے اپنے آپ کو ان حالات میں رکھنا ضروری ہے جو نئے طریقے کی تقویت کا باعث ہیں۔ ایسے کام تمھیں انجام دینے چاہییں جو قدیم طریقے کے بالکل خلاف ہوں اور اپنے ارادے کو ہر ممکن طور پر مضبوط کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(۲) جب تک نئی عادت بخوبی قائم نہ ہو جائے کسی استثنائی صورت

کو پیش آنے نہ دو ۔ ہر تنزلز کی مثال ایسی ہی کہ تاگے کا پنڈا جسے تم لپیٹ رہے ہو تمھارے ہاتھ سے گر جائے ۔ پنڈے کے ایک وقت گر جانے سے جس قدر ایک وقت تاگہ لپیٹا جاتا ہی اس سے کئی گنا کھل جاتا ہی۔

(۳) اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اُٹھاؤ۔

(۴) کوشش کو تازہ رکھنے کے لیے روزانہ بے غرضانہ طور پر کچھ نہ کچھ کام انجام دو یعنی معمولی غیر ضروری امور میں باقاعدہ طور پر جرأت اور بے لوثی کا ثبوت دو اور روزانہ کچھ نہ کچھ معمولی کام انجام دو جس کے انجام دینے کا سبب یہی کافی ہی کہ وہ مشکل ہی۔ اس عادت سے یہ ہوگا کہ جب کام کا وقت آئے گا تو تم اس کے لیے پہلے سے تیار رہوگے ۔ جس شخص کو معمولی غیر ضروری امور میں ایثار ، عزم و ثبات اور یک جہتی کی عادت ہوگئی ہی وہ معرکے کے دن زبردست ستون کی طرح اپنی جگہ قائم رہے گا ۔

ایک نہایت عمدہ عادت جس کو ہم اپنی زندگی میں اختیار کرسکتے ہیں یہ ہی کہ اپنے روزمرہ کے معمولی کام اور فرائض کو کبھی آیندہ کے لیے محض اس وجہ سے اُٹھا نہ رکھیں کہ وہ کسی قدر مشکل یا ناگوارِ خاطر ہیں ۔ یہ عادت ہماری زندگی کے لیے اور روزمرہ کے معمولی سینکڑوں امور کی انجام دہی کے لیے از بس ضروری ہی۔ اس صورت میں ہادلی کے سامنے ہم ہچکچاتے ہوئے کھڑے نہیں رہتے کہ بھئی اب کیا تیریں، کل یا پھر کسی وقت تیریں گے بلکہ گہری سانس لے کر کود پڑتے ہیں ۔ جو شخص زندگی کے تمام جزئی امور میں اس عادت پر استقلال کے ساتھ قائم رہتا ہی وہ ضرورت کے وقت کھویا ہوا نہیں رہتا بلکہ اس کے لیے مضبوطی کے ساتھ تیار رہتا ہی۔

دوسری عمدہ عادت یہ ہی کہ ہر کام کو جس قدر ممکن ہو اچھے سے اچھے

طریقے پر انجام دینے کی کوشش کرو اور کسی قسم کا دقیقہ اس کی بہتر طریقے سے تکمیل میں اُٹھا نہ رکھو۔ یہ ایک عمدہ عادت ہے جس کی نشو و نما بچپن میں بتدریج ہوسکتی ہے۔ اکثر صورتوں میں ایک کامیاب اور ناکام آدمی میں بڑا فرق یہی ہوتا ہے کہ کامیاب آدمی نے اپنی اس عادت کی وجہ سے کامیابی حاصل کی ہے اور ناکام آدمی اس کے فقدان کی وجہ سے ناکام رہا ہے۔

ان دونوں عادتوں کو اپنے اوپر لازم گردانو تو پھر تمہارا بیڑا پار ہے۔

بعض اچھی عادتیں

ذیل کی مثالیں یہ واضح کرنے کے لیے دی گئی ہیں کہ گو جبلتیں اور بنیادی خواہشیں فطرتِ انسانی میں مشترک ہیں لیکن ہماری دماغی اور جسمانی عادات ہمارے شخصی کردار کا باعث ہیں۔

ذاتی تعلقات میں وفاداری کی عادت جس کی بدولت اپنے رفیق کو بوقتِ ضرورت اپنے حال پر کبھی چھوڑ نہیں دیا جاتا، راست بازی کی عادت اور دغا بازی یا ناجائز فائدہ اُٹھانے سے نفرت، دوسروں کا خیال رکھنے کی عادت جس کی ضد خود غرضی اور نفسانیت ہے، خلق و تواضع اور آداب شناسی کی عادت، اپنے ناموافق حالات یا کاربرآری نہ ہونے کی صورت میں بدمزاج نہ ہونے کی عادت، خوش و خرم رہنے کی عادت، ہمیشہ ترش رو اور چیں بجبیں رہنے سے نفرت، اپنے آپ کو قابو میں رکھنے اور حاضر دماغی کی عادت، فریضہ شناسی کی عادت، استقلال اور تحمل کی عادت یعنی مشکل کے وقت یا ناموافق موقع پر یا تھکن کی صورت میں استقلال کے ساتھ جمے رہنے کی عادت، بہتر سے بہتر طریقے اور پوری دلچسپی کے ساتھ کام

انجام دینے کی عادت ، وسایل پر قابو رکھنے اور اختراع کی عادت ، کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھنے اور کھوئے ہوئے نہ رہنے کی عادت ، کسی چیز کو بہتر طریقے سے سیکھنے اور ذہن نشین کرنے کی عادت ، موضوع سے نہ ہٹنے کی عادت باقاعدہ ، منظم اور پابندی کے ساتھ رہنے کی عادت ، پیش بینی اور نتایج سے قبل از قبل آگاہ رہنے کی عادت ، مسئلے کے برے بھلے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کی عادت ، معقول استدلال سے کام لینے کی عادت اور محض دوسروں کے خیالات کو قبول کرنے سے گریز ، اشیا کے مالہٗ و ما علیہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی عادت ، فیصلہ اور ارادہ کی عادت ، نئے خیالات اور نئے امور کو سمجھنے کے لیے آمادگی اور اپنی رائے کو بدلنے کی صلاحیت کی عادت ، بذلہ سنجی کی عادت ، دماغ کو چست اور مستعد رکھنے کی عادت ۔

مقارنت کی وجہ سے محبت اور نفرت

ہر شخص کسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے اور کسی چیز کو برا اور اس کے اس طرح سمجھنے کی وجہ سے اس کے طرز عمل پر کچھ نہ کچھ اس کا اثر ضرور مترتب ہوتا ہے ۔ اب یہ سمجھنے کے لیے کہ کیوں وہ کسی چیز کو اچھا سمجھتا ہے اور کسی چیز کو برا اس کے گزشتہ تجربات سے واقف ہونا ضروری ہے ۔

یہاں ہم اس چیز کو اصطلاحی طور پر سمجھانے کی کوشش نہیں کریں گے بلکہ ایک سیدھا سادا اصول بیان کریں گے جو یہ ہے ۔ ہم اس چیز یا اس شخص کو پسند کرتے ہیں جس کا سلسلہ حافظے میں کسی خوش گوار واقعے کے ساتھ ملتا ہو اور اس چیز یا اس شخص کو پسند نہیں کرتے جس کا سلسلہ حافظے میں کسی ناگوار واقعے کے ساتھ ملتا ہو ۔ یہ ضروری

نہیں ہے کہ یہ ناگوار یا خوش گوار واقعہ ہمیں یاد رہے۔

توضیحاً ہم چند مثالیں بیان کریں گے۔ فرض کرو کہ ایک شخص ایک عورت پر فریفتہ ہے اور فرض کرو کہ کسی خاص موقعے پر جب کہ اس کے جذبات محبت موجزن تھے (اور شاید یہ اس روز کا واقعہ ہے جب کہ اس کو پہلے پہل معلوم ہوا تھا کہ وہ اس عورت کے تیر مژگاں سے گھایل ہوا ہے) اس نے آسمانی رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ کسی سے محبت خوش گوار واقعہ ہی ہو سکتا ہے۔ اب ہر وہ چیز جو اس شخص کے دماغ میں اس واقعے سے بہت کچھ مقارنت رکھتی ہے ابتدائی خوش گوار جذبات کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔ آسمانی رنگ خصوصاً وہ آسمانی رنگ جو اس کے لباس کا تھا، تمام عمر کے لیے اس شخص کا پسندِ خاطر رنگ ہو جاتا ہے اور گو ابتدائی واقعہ بالکل فراموش ہو جائے لیکن اس کا اثر باقی رہتا ہے۔

بعض حالات میں ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک شخص کا پسندیدہ رنگ اس کمرے کی دیوار کے کاغذ کا رنگ تھا جس میں اس کا زمانۂ طفولیت گزرا۔ بعض صورتوں میں تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کسی رنگ کی پسندیدگی کا سبب لباس کا وہ رنگ تھا جو اس شخص کی ماں اس کے بچپن میں پہنتی تھی اور جب کہ وہ دو برس کا بچہ تھا۔ بہر حال خوش گوار اور ناگوار تجربات کی کوئی حد نہیں ہے جن کی بنا پر محبت اور نفرت پیدا ہو سکتی ہے۔

مرغوب بھجن یا گیت کی وجہ ترجیح اس گیت یا بھجن کی لے نہیں ہے بلکہ بچپن یا بچپن کے بعد کے زمانے کے تاثرات ہیں۔ خاص خاص پھولوں کے مرغوب ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔

لوگ اکثر اپنے مذاق اور میلان کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور

بعض اوقات اپنی اس قسم کی گفتگو میں مشتعل بھی ہو جاتے ہیں ۔ دو نیوزیلینڈ کے رہنے والے آکلینڈ اور ولنگٹن کے شہروں کے متعلق بحث کرتے ہیں ۔ ایک کہتا ہے کہ آکلینڈ بہتر اور خوب صورت شہر ہے اور لوگ بھی یہاں کے ملنسار ہوتے ہیں اور موسم بھی یہاں کا خوش گوار ہوتا ہے وغیرہ ۔ دوسرا شخص کہتا ہے کہ آکلینڈ اچھا شہر نہیں ہے بلکہ ولنگٹن اچھا شہر ہے اور ولنگٹن کو ترجیح دینے کے وجوہ بیان کرتا ہے لیکن ان کی اس ترجیح کی وجہ دس میں نو حصے یہی ہے کہ ایک کو آکلینڈ میں خوش گوار واقعات پیش آئے ہیں اور دوسرے کو ولنگٹن میں ۔

ہم میں سے بہت سے لوگ اسی قسم کے نامعقول میلانات اور رجحانات رکھتے ہیں ۔ ان کی اصلیت سے واقف ہونا اچھا ہے کیوں کہ واقف ہونے کی صورت میں ہم اپنے آپ کو اپنی "جبلّی" یا "وجدانی" نفرتوں سے باز رکھ سکیں گے حالانکہ ہماری یہ نفرتیں جبلّی یا وجدانی نہیں ہو سکتیں ۔

پسند کے رنگ یا پسند کے پھول میں کوئی اہمیت نہیں لیکن ویلز کے باشندوں سے ہمارے تعصب کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہم مدرسے میں تھے تو ایک ویلز کا لڑکا ہمیں دق کرتا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تعصب کے نتایج بہت اہم اور دُور رس ہوتے ہیں ۔ یا پھر ہمیں ایسے تمام اشخاص سے نفرت ہو جن کے خط و خال خاص قسم کے ہوں جس کی وجہ کوئی خاص واقعہ ہو جس کو ہم بالکل بھول گئے ہوں ۔ اگر ہم کو والدین سے محبت تھی تو ممکن ہے ہم اپنے خیالات میں محدود و پابند

رہیں اوران کے خیالات کی طرف داری کریں اور اس سیاسی جماعت یا گرجاسے تعلق رکھیں جس سے ان کو تعلق تھا۔ برخلاف اس کے اگر ہمارا بچپن خوش گوار نہیں رہا ہی تو ہم ان تمام امور کی مخالفت کریں گے جن کے ہمارے والدین موید تھے۔ اگر کسی جوشیلے اشتراکی نے کبھی ہماری ہتک کی ہی تو ہم بلا کسی معقول وجہ کے اشتراکی نظریوں کی مخالفت کریں گے۔ اگر کبھی کسی آسٹریلیا کے باشندے سے ہماری دوستی رہی ہو تو اس کا اثر مملکت برطانیہ کے متعلق ہمارے خیالات و جذبات پر عائد ہوگا۔ ہمارے میلانات اور تعصبات بہت قدیم اور بھولے بسرے واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ممکن ہی کہ ایک شخص پُرجوش شاہ پرست اس وجہ سے ہو کہ جب وہ لڑکا تھا تو اس نے بھری مجلس سے کے مضمون پر انعام حاصل کیا تھا۔ ممکن ہی کہ ایک شخص کو تمام چھوٹی ناک والی عورتوں سے نفرت ہو جس کی شاید یہ وجہ ہو کہ جب وہ بچہ تھا تو اس کی آیا کا سلوک اس کے ساتھ اچھا نہ تھا اور اس آیا کی ناک چھوٹی تھی۔ ممکن ہی ایک شخص ان تمام آدمیوں پر اعتماد کرے جن کی آواز نرم ہو جس کی وجہ محض یہ ہو کہ کبھی ایک نرم آواز والے شخص سے اس کو سابقہ پڑا تھا جس پر وہ پورا بھروسا کرتا تھا۔ ممکن ہی ایک شخص نیلے رنگ کی آنکھوں کو بھورے رنگ کی آنکھوں سے زیادہ پسند کرے جس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی بیوی کی آنکھیں بھوری ہیں۔

ہم اس صداقت کو مبالغہ کا رنگ دے کر یہ نہیں کہتے کہ محبت اور نفرت کی لم یہی ہی۔ یہ بات نہیں ہی لیکن اکثر و بیشتر حالات میں ہماری محبت اور نفرت اور ہمارے میلانات اور تعصبات کی بڑی وجہ یہی ہی۔

انجمن کی چند دوسری مطبوعات

۱۔ **مقالات حالی** حصہ اول ۔ مولانا حالی مرحوم کے ۲۴ مضامین کا مجموعہ جو مذہب، اخلاق، تعلیم، ادب، فلسفہ اور سیاسیات وغیرہ موضوعات پر مشتمل ہے۔ کتاب اعلیٰ درجے کے کاغذ پر بہت نفیس چھپی ہے۔ حجم ۳۱۰ صفحات، قیمت مجلد چار رُپے، غیر مجلد تین رُپے آٹھ آنے۔

۲۔ **مقالات حالی** حصہ دوم ۔ اس میں مولانا حالی کی تمام تقریریں اور مشہور نامور کتابوں پر تبصرے اور تقریظیں ہیں۔ اُردو ادب کی بے مثل کتاب ہے۔ کاغذ اور چھپائی اعلیٰ درجے کی ہے۔ حجم ۲۲۴ صفحے، قیمت مجلد دو رُپے، غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۳۔ **باغ و بہار یا قصۂ چہار درویش** ۔ میر امّن دہلوی کی یادگار زمانہ تصنیف جو فصاحت اور سلاست میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ انجمن نے یہ کتاب خاص اہتمام سے طبع کی ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن کا محققانہ مقدمہ اور آخر میں الفاظ و محاورات کی فرہنگ ہے۔ حجم ۲۷۹ صفحات، قیمت غیر مجلد دو رُپے، مجلد دو رُپے آٹھ آنے۔

۴۔ **اندرون ہند**۔ نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کی تصنیف (Inside India.) کا ترجمہ جو مولوی سید ہاشمی صاحب نے بہت فصیح اور سلیس زبان میں کیا ہے۔ انھوں نے مختلف یونیورسٹیوں میں لیکچر دیے اور انھیں اس ملک کے دیکھنے اور یہاں کے نامور اصحاب سے ملنے کا موقع ملا۔ ان کے مشاہدات اور خیالات پڑھنے کے قابل ہیں، بہت دلچسپ کتاب ہے۔ حجم ۴۳۹ صفحات قیمت مجلد سواتین رُپے غیر مجلد تین رُپے۔

۵۔ **شکنتلا** ۔ یہ کالی داس کی مہا تصنیف ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی تمام شائستہ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اُردو میں بھی اس کا وجود ہے لیکن مسخ صورت میں۔ اب پہلی بار راست سنسکرت سے سید اختر حسین صاحب نے پوری نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ کالی داس کی خوبیوں کو قائم رکھا جائے۔ حجم ۱۴۶ صفحات، قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے، غیر مجلد ایک روپیہ۔

{ ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی }

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 115.

HAMĀRĪ NAFSIYYĀT

(Psychology for Every Man and Woman)

by

E. A. Mander

Translated by

SHAIDA MUHAMMAD

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),

DELHI.

1939